جنرل پبلشنگ ہاؤس بندر روڈ کراچی

83

شہ پارے

"نادم سیتاپوری"

مکتبہ سلطانی بمبئی ۳

ناشر:-

سُلطان حسین مالکِ مکتبۂ سُلطانی

ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

باہتمام سلطان حسین مالک سلطانی فاین آرٹ پریس بمبئی ۳ شایع کی گئی

۱۵ر مارچ ۱۹۴۶ء

(بار اوّل)

قیمت دو روپے آٹھ آنے
۲؍۸

فہرس

"ہما" خلاق حسین (بار ایٹ لا لکھنؤ) کے نام

(نادم سیتاپوری)

"پیش لفظ"

میرے افسانوں کا مجموعہ "منجدھار" ایک عرصہ سے مکمل پڑا ہے، قریب قریب سب کاپیاں چھپ گئی ہیں، صرف پہلا جز یعنی کل ۱۶ صفحہ آپ کی وجہ سے رُکے ہوئے ہیں افسانوں کے مسودات بھیج رہا ہوں انہیں پڑھکر گیارہ صفحہ کا کچھ لکھ دیجئے ـــــ مگر جلد۔ بس دو ہی چار دن میں عین ذرہ نوازی ہوگی ـــــ

آپ کا ـــــ کا ناؔدم

برادرم قمر نعمانی سہسرامی کی معرفت ناؔدم سیتاپوری صاحب کا یہ فرمان جب میرے پاس پہنچا تو آپ یقین فرمایئے کہ میں کچھ اُلجھن میں پڑ گیا اس لئے کہ ناؔدم سیتاپوری صاحب ہندوستان کے بہت پرانے لکھنے والے ہیں اور یہ اس وقت سے لکھ رہے ہیں جب اردو ادب کے مطلع پر آج کل کی طرح بیشمار تابناک ستارے نہیں جگمگا رہے تھے۔ اور جبکہ ہمارے ادب میں "آرٹ" کی کمی تھی۔ غور و فکر سوچ سمجھ کی ضرورت کی اہمیت کو بہت کم سمجھا جایا کرتا تھا۔ ایران اور طوران کی سُناتے وقت ہمارے ادیب اس بات کو سوچنے کی قطعاً ضرورت نہ سمجھتے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں حقیقت کا اس میں کہاں تک دخل ہے واقعات کی روشنی میں ان کے بیانات کی شکلیں کس درجہ لغو اور مضحکہ خیز بنجاتی ہیں اسطرف توجہ دینے کی ضرورت کو انہوں نے کبھی اچھی طرح سمجھا ہی نہ تھا۔ مگر چونکہ اسوقت لکھنے والے محدود تھے لہٰذا ان کا دائرہ مختصر تھا اور وہ سب پر چھا لئے گئے تھے۔ ان کی چھوٹی سی چھوٹی باتوں کو سراہتے ہوئے ان کی بڑی سے بڑی غلطیاں اس طریقہ پر نظر انداز کردی گئیں کہ ان کے دماغ میں ابھی ان غلطیوں کا کبھی دھندلا سا خیال بھی نہ پیدا ہوسکا اور بس وہ سمجھتے ہیں اپنے آپ کو یہی سمجھتے رہے کہ وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہیں۔ اتنے بڑے ہیں اتنے

اونچے ہیں کہ ان تک کبھی کوئی پہونچ ہی نہیں سکتا۔

اور مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھر بھی جھجک نہیں محسوس ہو رہی کہ موجودہ دور سے پہلے کے دور کا ہر ادیب مکمل آرٹسٹ نہیں تھا۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جنہوں نے کبھی ماہر فن عکاس سے پہلے وہ اس ماحول کو اچھی طرح جانتے اور سمجھنے کی کوشش کریں جسے وہ پیش کر رہے ہیں۔ اور یہی ایک ایسی بنیادی کمزوری تھی جس سے بڑے سے بڑا ادیب بھی محفوظ نہ رہ سکا یہاں تک کہ نیاز فتحپوری جیسے مشہور و معروف ادیب نے بھی اکثر و بیشتر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ نیاز صاحب کو ہمیشہ پارسی حسن ملکوتی نظر آیا۔ ان کے اس بیان کی روشنی میں ہم نے بھی اپنے ذہن میں یہ اچھی طرح جما رکھا تھا پارسی دوشیزہ دنیا بھر کی عورتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت طرحدار اور نازک ہوتی ہے۔ حوران بہشتی کے جواب میں اگر دنیا کی کوئی عورت غرور و فخر کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہی عورت ہے، مگر جب حقیقت بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آئی تو ہمارے یقین کو ایک زبردست ٹھیس لگی۔ اور ہم نے سوچا کہ کاش نیاز صاحب نے اپنی ذمہ واریوں کو محسوس کیا ہوتا اور صرف نیاز فتحپوری صاحب ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہمارے بیشتر پرانے ادیبوں نے چھان بین کی زحمت کبھی گوارہ نہیں فرمائی۔ ان سب کے یہاں مشاہدات سے زیادہ خیالات کو دخل رہا ہے۔ انہوں نے قیاس آرائیوں ہی کو اپنے ادب کی معراج سمجھ رکھا تھا۔

ان کے یہاں الف لیلیٰ کی رنگین داستانیں تھیں۔ بے سر و پا پلاٹ کا الجھاؤ تھا۔ بیشمار کیرکٹر تھے، مقفّیٰ عبارت آرائی اور لفظوں کے الٹ پھیر میں الجھ الجھ جانا ہی قابل قدر سمجھا جاتا تھا۔ کچھ حضرات عہدِ قدیم دبدبہ آرائیوں کا ذکر چٹخارے لے لیکر کرتے تھے۔ نثر میں بھی قافیہ

ONCE APAN A TIME پیمانی کا جنون حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اور کچھ اصحاب
THER WAS A KING کے قائل تھے۔

لہٰذا قدرتی طور پر جب نادم سیتاپوری صاحب کی کتاب "منجدھار" پر کچھ لکھنے کا
... کیا کرنا چاہیے۔

میں نے نادم صاحب کو اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ میں ان کے بارے میں سوا اس کے اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ میرے مخلص دوست ہیں اور ہندوستان کے بہت پرانے لکھنے والے۔ اور نہ جانے کیوں وہ مجھے بیحد پسند کرتے ہیں۔ اور پھر میں ان کی دوستی محبت اور خلوص کا دل سے قائل ہوں۔ تو پھر آپ ہی بتائیے کہ میرے لئے کتنا مشکل سوال تھا، کتنا اہم فریضہ کہ میں ان کی کتاب پر مقدمہ لکھوں۔

آپ یقین فرمائیے کہ ادب کے معاملہ میں جتنا اور جو کچھ بھی میں سمجھتا ہوں میں اُسے بلا جھجھک کہدینے کا پُرانا مجرم ہوں۔ خواہ مجھے اس جرم کی پاداش میں کتنی ہی بڑی سزا کیوں نہ بھگتنی پڑے میرے وہ احباب اور اعزّا جو اکثر و بیشتر ادیب یا شاعر ہیں مجھ سے محض اس لئے بدظن ہو گئے ہیں، محض اس بنا پر مجھ سے قطع تعلق کر چکے ہیں کہ میں نے ان کے "ادبی کارناموں" پر غلطی سے اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔

اور پھر میں نے سوچا نادم صاحب بھی تو آخر پرانے ہی لکھنے والوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے یہاں بھی یہی تمام چیزیں ہوں گی اور پھر یہ تمام باتیں سوچ کر میں کانپ کانپ اٹھا دوستی کا پردہ چاک ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگا اور اس پردہ کے پیچھے مجھے دشمنی کا بھیانک چہرہ نظر آیا۔ میں نے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے کیا بات تھی میں نادم صاحب جیسے

کرم فرما کو اتنی آسانی کیساتھ کھو دینے پر اپنے آپ کو کسی طرح بھی راضی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مسودات لپیٹ کر میز کی دراز میں رکھدیئے اور یہ طے کرلیا کہ مقدمہ ہرگز ہرگز نہ لکھوں گا۔ خواہ نادم صاحب مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔

[illegible] جب میں گھر آیا تو عذرا بیگم صاحبہ مدیرہ ماہنامہ "حجاب" نے پورے شوق کیساتھ مجھ سے کہا:۔

"کیوں ——— ؟" میں سمجھا نادم صاحب کا شاید کوئی تازہ حکمنامہ موصول ہوا ہے

"کہلا اُنہوں نے پھر کہلا بھیجا ہے"

"انہوں نے نہیں کہلا بھیجا بلکہ ان کے افسانے خود اپنی وکالت کر رہے ہیں"

"کیا مطلب ——— ؟"

"جی ہاں! عذرا بیگم نے فرمایا، "میں نے آج دن میں انکے تمام مسودات پڑھ لئے ہیں"

"کیسے ہیں افسانے ———"

"پڑھ لیجئے ——— آپ نادم صاحب کے قایل نہ ہو جائیں تو میرا ذمہ۔ موجودہ دور کے صفحہ اول کے لکھنے والوں سے یقیناً ان کا درجہ کم نہیں ہے"

"اچھا ——— !" مجھے بڑی خوشی ہوئی اور پھر میں نے وہ تمام مسودات پڑھے۔

نادم صاحب کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے اپنی غلطی کا شدید طور پر احساس ہوا میں نے سوچا کہ اگر میں نے نادم صاحب کو پہلے ہی پڑھا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ کاہے کو آج اتنی اُلجھن ہوتی۔

نادم صاحب کے تمام تر افسانے جو "منجدھار" میں شامل ہیں حقیقتاً وہ سب کے سب اس قابل ہیں کہ انہیں اردو ادب میں ایک خاص درجہ دیا جا سکے۔ جیسا

کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہمارے ادب نے اب کافی ترقی کرلی ہے۔ اب جو بھی لکھا جاتا ہے بہت
سوچ سمجھکر اور کسی خاص مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے محض قیاس آرائیوں اور لفظی گورکھ دھندوں
کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمارا ادب ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر گہری نظر ڈالتا ہے۔ زندگی کے
تمام پہلوؤں کا تجزیہ [illegible] اچھی
طرح سمجھ لیا ہے کہ ادب زندگی کے لئے ہے۔ ہم ادب برائے ادب کے خواب شیریں
سے چونک پڑے ہیں۔

اب ہمارا ادیب جو بھی لکھتا ہے بہت سوچ سمجھکر لکھتا ہے کہ اس کا ہر قدم ایک
نئی منزل، ایک نئی شاہراہ کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے، وہ جو بھی لکھتا ہے یہ سمجھکر لکھتا ہے کہ اس کے
مضامین ملک و قوم کی کسی نہ کسی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں ضرور معاون ثابت ہوں گے
وہ اس نظریہ کے تحت قلم اٹھاتا ہے کہ اُسے اپنے قلم سے بہت کچھ کام لینا ہے، کچلی ہوئی ذہنیتوں
بجھی بجھی زندگیوں اور سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرنا، انہیں ان کے صحیح مقصد کی طرف رجوع
کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے، وہ جانتا ہے اور خوب سمجھتا ہے کہ آج کل الف لیلی کی رنگین داستانوں
اور حسن و عشق کی دلگداز کہانیوں کی ضرورت نہیں — ملک کی بے چینی اور اس کی بیماری
کا علاج میٹھی میٹھی لوریوں میں نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایسی کڑوی گولیوں کی ضرورت ہے
ایسے ایسے تیز نشتر درکار ہیں اُسے جو اس کے زخموں کو کرید کرید کر صاف کر دیں، سڑے، بدبودار
اور گھناؤنے پھوڑے کو ختم کردیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاکہ پھوڑا بڑھتے بڑھتے ناسور نہ بن جائے
کہیں پورا جسم سڑ سڑ کر نہ گلنے لگے۔

اور اب ہم ہنس بھی تو کافی چکے ہیں۔ اور اسی ہنسی ہنسی ہی میں تو ہم نے اپنا سب
کچھ کھو دیا ہے، ہم مفلس ہو چکے ہیں، مذاق مذاق میں محض تفریحات ہی کی خاطر تو ہم نے

اپنے لئے ذلتیں اور رسوائیاں خریدی ہیں اور اسی لئے ہمیں اب ایسے ادب کی ضرورت نہیں ہے جو ہمیں محض ہنساتا رہے۔ ہم دنیا و مافیہا سے بےخبر اپنا پیٹ پکڑے ہنستے رہیں۔ اور ہمارے آج کل کے ادیب اس راز کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں لہذا ان کے مزاح میں بھی کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوتا ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں بڑے بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اب ان کے مزاح پر طنز غالب آچکا ہے۔ ایسا طنز جو ہمارے لاکھ غافل ہونے پر بھی ہمیں جھنجھوڑ دے، ہمیں مجبور کر دے کہ ہم کچھ سوچیں سمجھیں اور پھر اسی سوچ و سمجھ کی روشنی میں ہم اپنے لئے کوئی راستہ تلاش کریں ایسا راستہ جس کے ذریعہ ہمیں اپنے منزل مقصود تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اور ہم جلد سے جلد اپنے مقصد کو پالیں۔

زمانہ بہت کافی بدل چکا ہے اور ہمارا ادب اور ہمارے ادیب بھی جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ لہذا لازمی طور پر وہ اپنا وقت اب فضول ضایع نہیں کرتے بساطِ ادب پر بڑے بڑے ماہر فن جمع ہیں اور وہ اپنی جد و جہد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانیکی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں آج کل اپنی انفرادیت قائم رکھنا ہر ادیب کے لئے ایک اہم مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ اپنی شہرت اور اپنی وقار قایم رکھنے کیلئے انہیں پیہم جد و جہد کرنی پڑتی ہے اگر بڑے سے بڑا ادیب بھی تا دیر خاموش رہے تو لوگ اسے بھلا دیتے ہیں۔ وہ حرفِ غلط کیطرح لوگوں کے ذہنوں سے مٹ جاتا ہے، آج کل کوئی ادیب نیا یا پرانا اپنے آپ کو یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ایک پہاڑ ہے۔ اور اس سے ٹکرانا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔

اور میں نے اسی نظریہ کی روشنی میں جب نادم صاحب سیتاپوری کے تمام افسانے پڑھے تو وہ مجھے ہر طرح جامع اور مکمل معلوم ہوئے۔ "منجدھار" میں نادم صاحب مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ کہیں وہ سنجیدہ ہیں۔ انتہائی سنجیدگی کیساتھ انہوں نے

نازک سے نازک مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اور کہیں پر وہ ہمیں ہنسا رہے ہیں۔ مگر اس انداز میں کہ ان کی مزاح نگاری پھکڑ بازی کی زد میں شمار نہ ہونے لگے۔ کہیں پر وہ ایک ماہر فن فنکار کی طرح جنسیاتی مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں۔ ایک بازاری طوائف انتہائی گھٹیا قسم کی جو صرف چند ٹکوں میں جنسی بھوک کو دور کر سکتی ہے۔ اس کے کیرکٹر اور اس کے ماحول کو نادم صاحب نے جس خوبصورتی کیساتھ ہمارے سامنے رکھا ہے وہ یقیناً حقیقت نگاری کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور یہیں پر ہمیں نادم صاحب کے آرٹ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ نادم صاحب دور حاضرہ کے ترقی پسند ادیبوں سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہیں وہ اس دور میں سب کے ساتھ ہیں۔

آپ مندرجہ ذیل کا ہر افسانہ پڑھیئے۔ اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ نادم صاحب ایک فنکار کی صورت میں ہمارے سامنے آئے ہیں کہ نہیں۔

۔ آنچ۔ بھلے آدمی۔ ٹکاہیاں۔ ہچکولے۔ جب جوانی آرہی تھی۔ ماموں ذات۔ اللہ کی دین۔ جہاں بات بنائے نہ بنے۔

اور اسی قسم کے دوسرے افسانے نادم صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نادم صاحب کا مشاہدہ کتنا وسیع اور نگاہیں کتنی دور رس ہیں وہ ماحول میں کس طرح جذب ہو جاتے ہیں۔

اس مجموعہ کے تمام تر افسانے ایسے ہیں جن میں زندگیاں چلتی پھرتی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ افسانہ کا ہر کردار ہمیں چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور افسانہ نگار کا یہ ایک ایسا کمال ہے جس کی موجودگی اسے ایک مکمل فنکار، آرٹسٹ کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور ہم آرٹسٹ کے آرٹ کو دل سے چاہنے لگتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ناظم صاحب کے یہ افسانے ملک کے طول و عرض میں بیحد پسند کئے جائینگے۔ اور ان کی کتاب "منجدھار" اردو ادب کی عمدہ کتابوں میں ایک قیمتی اضافہ ثابت ہو گی۔

عادل رشید

کیڈل روڈ، ماہم بمبئی ۱۶، ۷ مارچ ۱۹۴۶ء

آنچ

سارا دن بہی کھاتہ کی چھان بین کرتے ـــ رو کڑوں کی میزانیں جوڑتے جوڑتے جب شام کو دوبے جی گھر میں آتے تو ریڈیو پر کھلتے اور چڑھتے بھاؤ سنتے ہی سنتے ان کی آنکھوں میں تھکاوٹ ـــ جوڑ جوڑ میں درد ـــ اور سارے بدن میں الکساہٹ کا سمندر موجیں مارنے لگتا۔ حقہ کے دو چار لمبے لمبے کش کھینچکر وہ خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے۔ تو یہ ریڈیو والے یا تو نئے طرز کی غزلیں شروع کر دیتے یا ٹھمریاں۔ کبھی کبھی دیہاتی پروگرام شروع ہو جاتا ـــ پاٹ دار آوازیں۔ ڈرامے کے مکالمے کان کے پردے پھاڑنے لگتے ـــ! انگریزی میں تقریر ہونے لگتی۔ ان کے تھکے ہارے دماغ میں یہ نری "غیر شاعرانہ" چیزیں اس طرح ٹکرا جاتیں جیسے "شئے لطیف" سے معمور دلوں میں سونے چاندی کے بھاؤ! ان کے تخیلات کی وسعتیں زیادہ سے زیادہ خبریں سن سکتی تھیں جن کو "بدرستی حواس خمسہ" اکثر وہ سن اور سمجھ کر اپنے منیم اور دوسرے سیاستدانوں سے فخریہ بیان کیا کرتے گویا کہ سیاسیات میں وہ مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کے ہم پلہ ہیں۔

ریڈیو بند کر کے وہ کرسی ہی پر لیٹے لیٹے پاؤں پھیلا دیتے ـــ!

اری جمنا ـــ! کہاں مر گئی۔ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔

جمنا — جی آئی لالہ جی۔ کہتی ہوئی آجاتی اور چپ چاپ بیٹھکر پاؤں کی انگلیاں اور انگوٹھے مروڑنے لگتی! دوبے جی آنکھیں بند کئے ہوئے منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لیتے جمنا کے گورے گورے ہاتھ لالہ جی کی پنڈلیاں دباتے رہتے، جن پر اُگے ہوئے بالوں کے گچھوں کو بچانے کیلئے وہ اپنے ہاتھوں کی گرفت ملائم اور ڈھیلی رکھتی —— اتنی دیر میں نہ جانے لالہ جی کتنی ہی دو دو منٹ کی نیندیں لے ڈالتے! جمنا کے ہاتھ اپنا وقت پورا کر کے تلوؤں کو سہلانے لگتے اور تلملا کر انگڑائیاں لیکر جاگ جاتے ان کو پاؤں خود بخود سمٹ کر نیچے ہو جاتے —!!

جمنا چپ چاپ چلی جاتی —

لالہ جی اٹھکر رسوئی میں جاتے — بھاجی — اُبلا ہوا ساگ — کھٹائی اور نمکین پوریاں، ہضم کرنے کے لئے چند جگر خراش ڈکاریں اس طرح لیتے جیسے "جاپانی مارکین" پھاڑی جاتی ہے۔ "اوم نارائن" کہتے ہوئے پلنگ پر لیٹتے ہی ان کو تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ نیند پوری کر لینے کے بعد صبح ہونے سے پہلے ہی ان کے بے ہنگم خراٹے ان کو جگا دیتے،

بیس پچیس سال سے ان کی زندگی کی روزمرہ یہی رفتار تھی۔!

جمنا — ایک نوخیز کلی تھی جاڑے، گرمی اور برسات کی پندرہ سولہ بہاریں اس نے اسی "دیالجیون" کی چھایا میں بتائی تھیں۔ وہ کتنی چھوٹی تھی جب دوبے جی نے اسے پال لیا تھا —! یہ خود اسے یاد نہ تھا۔

ماں کا نام تو اس نے ضرور سنا تھا لیکن اس نے اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی جس پر ماں ہونے کا شبہ کر سکتی! دوبے جی کا اندھیرا گھر اس کے آنے سے پہلے ہی ایسا تھا۔ وہ ایک بڑے کاروباری آدمی تھے، اپنی اونچی ذات کے لحاظ سے تو ان کو ایک "دیانت" ہونا

چلے ہوئے تھا لیکن ان کی سفید سفید مونچھیں جن کو حقّے کے نیلگوں دھوئیں نے بھورا کر دیا۔ کچھ کم ساٹھ سال سے اسی ماحول میں بڑھتی رہی تھیں۔ جن سے ذہنیت کاروباری اور دماغ سرمایہ پرست ہو چکا تھا۔

اُن کی بیشمار پُونجی جس پر ہر سال دیوالی کے دیئے جگائے جاتے تھے، بنکوں میں بہت کم تھی۔ زیادہ تر اُن کے دفینے اسی گھر میں گڑے ہوئے تھے جس میں ان کا ایک نوکر اور سکے پالک۔ جمنا رہتی تھی۔ بوڑھا نوکر لالہ جی کی سیوا کرتے کرتے جمنا کی طرح اُن کے کنبہ کا ایک رُکن بن گیا تھا جس پر انہیں اتنا ہی بھروسہ تھا۔ جتنا اعتبار وہ خود اپنے آپ پر کر سکتے تھے۔ دوبے جی کی دھرم پتنی۔ صرف ایک بچے کی ماں ہونے کے بعد ہی اس دنیا سے چل بسی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ ہی اس کمسن بچہ کو بھی اپنے پاس بُلا لیا تھا جس میں شاید یتیم رہ کر جینے کی سکت باقی نہ تھی ۔۔۔!

بیس پچیس سال ادھر کی یہ بات تھی ۔۔۔! اس کے بعد بھول کر بھی دوبے جی نے کبھی اپنا گھر بسانے کا خیال نہیں کیا۔ شاید ان کا دل گرہستی کے جنجال سے گھبرا گیا تھا ۔۔۔! وہ سوچتے تھے کہ اگر بھگوان مجھے آباد ہی رکھنا چاہتے تھے تو اُجاڑتے کاہے کو۔ اب ان کے دل میں سوائے روپیہ جوڑنے کے اور کوئی بھی ہوس نہ تھی۔ اس بیس پچیس برس کے بڈھے کے دل میں کوئی بھی ایسا جذبہ نہ جاگ سکا جو ان کے جیون میں آشاؤں کا ایک دیا بھی جلا سکتا وہ ایک برف کی منجمد چٹان کی طرح بےحس و حرکت اپنی کاروباری دنیا میں مصروف رہتے ۔۔۔ ان کے حسیات میں اتنے دنوں سے کوئی بھی انقلاب نہ آ سکا! کولہو کے بیل کی طرح دم بھر کام میں لگے رہنا، کھانا، پینا، ریڈیو سننا اور سو جانا ۔۔۔ اس سے زیادہ ان کی زندگی کا کوئی پروگرام نہ تھا ۔۔۔!!

جمنا کی امنڈتی ہوئی جوانی بھی ان کو چونکا نہ سکی۔ گویا ایک چھوٹی سی ندی جس

میں موجوں کی روانی مدھم سروں میں گا رہی ہو ۔۔ اُن کے سپنوں کا سنسار ، کتنا خاموش جیون تھا ۔ جس میں کبھی بھی کوئی رنگین خواب نظر نہ آسکا ۔ بڑھاپا ۔ سو بیماریوں کی ایک دی ہوتی ہے ۔ فصل کی معمولی تبدیلی سے کمزور جسم کو نت نئے روگ لگ جاتے ہیں ۔ دو بے جی بھی ایک صبح جب سو کر اُٹھے تو سر میں میٹھا میٹھا درد اور خفیف سی حرارت تھی ! بستر پر پڑے پڑے جمنا کو آواز دی ۔۔!

" جا کر دکان پر فون کر دے ! آج میرا جی اچھا نہیں ہے شائد نہ آسکوں او

" جی اچھا " کہتی ہوئی جمنا " فون " کرنے چلی گئی ۔

تھوڑی دیر بعد واپس آگئی ۔۔۔

" کیسی طبیعت ہے لالہ جی "

" اچھا ہوں کچھ سر میں درد ہے " لالہ جی تکیے پر ماتھے کو ٹیکتے ہوئے بولے !

" لاؤ میں سر دبا دوں " جمنا نے کہا !

" نہیں کیا کرو گی " آنکھیں بند کئے ہوئے لالہ جی نے جواب دیا !

" نہیں ۔۔ لاؤ میں سر دبا دوں گی ۔ تکلیف نہ ہو گی " جمنا بولی ۔

لالہ جی بدستور کروٹ لئے ہوئے لیٹے رہے ۔ جمنا آہستہ سے پلنگ پر بیٹھ کر سر دبانے لگی ! ان کی آنکھیں بیجان مجسمہ کی طرح بند تھیں ! جمنا کے گورے گورے ہاتھ انکے ماتھے کی سلوٹوں اور سر کے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں پر اس طرح تیر رہے تھے ۔ جیسے کسی نہر میں بطوں کا جوڑا رقص کر رہا ہو ! اُس کی آنکھوں میں فرض اور انہماک کیساتھ سُرخ سُرخ ڈورے چمک رہے تھے جن کی مقناطیسی کشش پتھر کی چٹانوں میں جنبش پیدا کر سکتی تھی ! لالہ جی کی پیٹھ سے لگی ہوئی اس کی دھانی ساری سے اس کا بلوریں جسم سنگ مرمر کی طرح جھلک

رہا تھا۔ اور جڑی ہوئی رانوں سے چقماق کے ٹکراتے ہوئے پتھر دل جیسی آنچ نکل رہی تھی ؛ لالہ جی کو خود حرارت تھی لیکن کئی بار اسکے گرم گرم دہکتے ہوئے ہاتھوں کی حدّت سے وہ چونک پڑے! پسینے کے چند قطرے جمنا کے ماتھے پر جمع ہوکر موجوں کی طرح مچلنے کے لئے بیقرار ہو رہے تھے! جن کو کئی مرتبہ اس نے اپنی بانہوں سے پونچھ ڈالا تھا۔ مگر بار بار ان کی بیقراریاں روکے نہ رک سکیں! اور چند قطرے لالہ جی کے جھریوں دار چہرہ پر ٹپک ہی پڑے انہوں نے آنکھیں کھولدیں۔

" رو رہی ہے ــــ جمنا "

"نہیں تو لالہ جی ــــ شائد پسینہ ٹپک گیا ہوگا " اس نے پیشانی پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

آج زندگی میں پہلی بار ان کی آنکھیں جمنا کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں۔ وہ بولے!

مدر ہنے دو ــــ شائد تم تھک گئیں!

"نہیں میں تھکی نہیں ــــ لالہ جی"

لالہ جی نے کروٹ بدلی! جمنا دوسری طرف بیٹھ کر پھر سر دبانے لگی!

ان کے ساکن جسم سے ایک بار جمنا کا تپتا ہوا جسم مس ہو گیا! منجمد خون کی روانی میں ایک تڑپ سی پیدا ہو گئی۔ برف کی چٹان سورج کی برق پاش کرنوں سے جنبش میں آ گئی۔ لالہ جی نے آج بیس سال کے بعد جوانی کی ہلکی ہلکی آنچ کو اپنی اپنی رگ رگ میں سرایت ہوتے ہوئے محسوس کیا! ان کے بڑھاپے میں نوجوانی کا سمندر لہریں لینے لگا۔ آنکھیں کچھ دیر کے لئے کھلی کی کھلی رہ گئیں اور دل کی حرکت لمحہ بھر کو رک گئی! ان کا جسم بے قابو ہونے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ وہ سچ مچ اس یکایک تبدیلی سے گھبرا اٹھے۔

پانی"

جمنا اٹھ کر پانی لینے کو چلی گئی۔ ان کے خیالات میں عجب ہیجانی کیفیت پیدا ہو رہی تھی!

دو گھونٹ پانی پی کر وہ اٹھ بیٹھے اور جمنا کو سر دبانے سے منع کر دیا۔

دو تین روز میں لالہ جی کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ لیکن ایک نئی خلش کانٹے کی طرح ان کے دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جس زندگی کے خاموش خواب آج پچیس سال سے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ساکن اور بےحس ہیں! ان میں دفعتاً ایسی خوفناک .... اور تباہ کن .... تبدیلی! ان کا سارا بدن کانپ اٹھتا جب وہ سوچتے کہ جمنا کو انہوں نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے ...... پھر ...... پھر بھی کیا ہوا .... مرد مرد ہی ہے ......!

ایک ہلکی ہلکی آنچ نے جس دوشیزگی کی مقناطیسی کشش ان کے جسم بھر میں کھپا دی تھی۔ ایک کانٹے کے مانند کھٹک رہی تھی۔ اپنی جوانی کے کتنے پریشان خواب اُن کو رہ رہ کر چونکا رہے تھے .... اب سے بہت دن پہلے کی زندگی یاد آ رہی تھی ــــ!

بیماری سے اٹھنے کے بعد دوبے جی نے کتنی راتیں اسی سوچ وچار میں گذاری تھیں!

جمنا اب بھی ہاتھ پاؤں دبا کر تلوے سہلاتے سہلاتے چلی جایا کرتی۔ ایک دن ان کی طبیعت کچھ زیادہ کسل مند تھی۔ دوکان سے آ کر ریڈیو بھی نہیں سُنا۔ رسوئی بھی نہیں گئے، چپ چاپ منہ لپیٹ کر پڑ رہے! مسکراتی ہوئی جمنا آئی!

"کھانا کھا لو لالہ جی۔

میں آج کچھ نہ کھاؤں گا جمنا۔ میرے بدن میں درد ہو رہا ہے۔ لالہ جی نے ایک انگڑائی لیکر آنکھیں کھولدیں۔

" تو میں بدن دبائے دیتی ہوں "

اُنہوں نے کروٹ لے لی۔ جمنا پاس بیٹھ کر آہستہ آہستہ پاؤں دابنے لگی۔ اُس کی کالی ساری کا پلو کئی مرتبہ جسم کی جُنبش سے سرک کر شانوں پر آگیا۔ اسکے ملائم ہاتھ سارا بوجھ ان کی پنڈلیوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ اور اس کا آدھا جسم لالہ جی کے جسم سے ٹکرا رہا تھا۔ اسکے جسم سے ویسی ہی آنچ نکل رہی تھی۔ جس کی بھینی بھینی خوشبو لالہ جی کی دماغ کی گہرائیوں میں گھر کر چکی تھی انہوں نے یکایک آنکھیں کھول کر کروٹ لے لی۔ جمنا اس طرف سے اٹھ کر پھر دوسری طرف بیٹھ گئی۔ اُس کے ہاتھ بدستور پنڈلیوں سے گذر کر اُن کی کمر تک دوڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی یہ ہاتھ پیٹھ اور شانوں تک پہونچ جاتے لالہ جی کی آنکھوں میں نیند کا نام تک نہ تھا۔ ان کے بے ہنگم خراٹے ضرور سو رہے تھے۔ بدن کا رواں رواں پھنکا جا رہا تھا۔ بار بار آنکھیں بند ہوکر خود بخود کھل جاتیں۔ جمنا کی نگاہیں زیادہ تر شانوں پر سرک جانیوالی ساری کی نگہبانی میں مصروف تھیں۔ جسے ہر بار وہ درست کرتی رہتی۔

جب لوہے کو نرم نرم آنچ پر تپایا جاتا ہے تو اس کی رنگت سُرخ انگاروں کی مماثلت میں بدل جایا کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد لوہے کا وہ بدنما ٹکڑا ایک خوبصورت لال کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ جس کی سختی اور ناہمواری کو آنکھوں کی جاذبیت قبول نہیں کرتی۔ بالکل یہی حالت لالہ جی کی ہو رہی تھی۔ ان کے جسم پر پڑی ہوئی بڑھاپے کی جھریوں میں آج بلا کا تناؤ تھا چہرے پر لٹکی ہوئی کھال دلی کیفیات کیساتھ موجوں کی طرح سمٹ کر نجانے کس آنے والے طوفان کیلئے راستہ چھوڑ گئی تھی۔ چہرہ خون کی روانی کی وجہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔

مست شرابی کی طرح مخمور آنکھیں کوندکر جمنا کی معصوم نگاہوں سے الجھ گئیں۔ "کروٹوں میں" زلزلہ آگیا۔ دونوں ہاتھوں نے "دھنش" کی طرح کج ہوکر بلند ہوتے ہوئے جمنا کے ماہتاب جیسے چمکتے ہوئے چہرے اور ساون کی گھٹاؤں کی طرح بکھرے ہوئے بالوں کا حلقہ بنالیا۔

پاس ہی گلی سے اونچے سُروں میں گانے کی آواز آرہی تھی۔

"کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ"

"یہ بھابیاں"

کسی بری نیت سے نہیں! دراصل بھابی کی عادت ہی تھی کہ ان کے پیٹ میں پانی پچتا ہی نہیں تھا۔ ذرا کسی نے کوئی بات کہی اور وہ بیچاری پیٹ پکڑے ہوئے دوڑیں گلنار۔ بوا نصیبن۔ بی مغلانی حتیٰ کہ رکمنی مہترانی کا بھی ہاتھ پکڑ کر کہہ دیتیں "بہن آج فلاں بیوی یہ کہہ رہی تھیں لے بھلا تم ہی بتاؤ میری جوتی کو کیا پڑی جو سب سے کہتی پھروں کہ یہ ہوا...... مجھ سے کہتی تھیں کسی سے کہیئے گا نہیں" یہ بالکل واقعہ ہے کہ صحیح اور سچے واقعات کو بلا کم و کاست "سنسنی خیز" بنا دینے کے معاملہ میں وہ رائٹر (Reuter) "فری پریس" اور بھائی امین سلونوی کی انڈیپنڈنٹ نیوز سروس کو بھی مات کئے ہوئے تھیں۔ دو کالمی اور چو کالمی خبروں کا تو ذکر ہی کیا اکثر ان کی بیان کی ہوئی خبریں معمولی اور روزمرہ کے واقعات کو بات کا بتنگڑ بنا دیتیں۔ ہوتا یہ تھا کہ اکثر صبح کی چاء پر اخبار آنے سے پہلے ہی وہ ایسی خبریں براڈ کاسٹ کر دیتیں کہ ایک ایک واقعہ پر سارا سارا دن ریویو کئے جاتے۔ اور معاملہ کی اہمیت میں کمی نہ ہوتی اسی لئے میں نے ان کا نام رکھ دیا تھا "بے چھپا اخبار" اس دن بھی بات تو کوئی نہ تھی صرف اتنا واقعہ تھا کہ سلیم کو کچھ حرارت سی معلوم ہو رہی تھی۔ میں ٹمپریچر لے رہا تھا۔ خدا جانے بھابی کو نگنائی سے کیا شبہ ہوا فوراً دوڑی ہوئی پہنچیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے تھرمامیٹر چھپاتے ہوئے جواب دیا "جی کچھ نہیں! آپ کو کیا؟"

بھابی کے ذوقِ اشتیاق میں ہلچل مچ گئی۔

"نہیں کچھ تو ضرور ہے تم کو بتانا ہوگا۔"

"تو آپ بلا پوچھے ہوئے نہیں مانیں گی؟"

"جی ...... جلدی بتائیے کیا بات؟"

میں نے ان کے کان کے قریب جا کر کہا بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے!

"یہ جو ہیں ...... کیا نام کہ بس سمجھ جائیے ان کے ہاں"

"ارے بھئی کچھ کہو گے بھی ...... کیا ہوا ان کے یہاں ......" بھابی نے زور سے رازداری کی داد دی۔

"وہی تو کہہ رہا ہوں آپ سنتی بھی ہیں؟ بس سمجھ جائیے کہ ان کے یہاں خوشی ہونیوالی ہے!"

"جھوٹ بالکل جھوٹ! دلھن کیا یہ سچ ہے؟" بھابی نے بیگم کو بھی مخاطب بنا لیا۔ وہ جھینپ گئیں۔

"خیر جانے دیجئے! اسی لئے تو کوئی بات آپ کو بتاتا نہیں ہوں۔ یہ جو آلہ لایا ہوں انگریزی یہ بھی جھوٹا ہے؟" میں نے جیب کے ایک کونہ سے تھرمامیٹر کا سر نکالتے ہوئے کہا۔

"کیسا آلہ؟ لاؤ دیکھوں تو!" بھابی کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"جی دیکھنے کی نہیں ہوتی ...... پھر یہ تو جھوٹا ہے"

"میں کہتی ہوں اس موئے آلے میں کیا ہے دیکھوں تو"

"میں بھی کہتا ہوں کہ یہ عورتیں نہیں دیکھتیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انڈے میں مرغی ہے یا مرغا۔"

بھابی جھینپ گئیں۔ بیگم مسکرا کر غسلخانہ میں بڑھیں۔ لیکن بھابی کو کہاں چین تھا میرے قریب سرک کر رازدارانہ انداز میں پھر پوچھنے لگیں "تمہیں میری جان کی قسم سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟"

"بات تو کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے کہ انکے یہاں لڑکی پیدا ہونیوالی ہے۔"

"تو اس آلے سے تم یہی دیکھ رہے تھے۔ میں اب سمجھی۔"

جس طرح اخبار کے نمائندے کسی لیڈر کے منہ کی بھاپ پاکر اپنے دفتر دل کی طرف خوش خوش بھاگتے ہیں بالکل اسی طرح بھابی نے "میرے بیان کو سُن کر" "عوام الناس" کی طرف رُخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے گھر میں بھابی نے یہ خبر براڈکاسٹ کر دی۔ اب کیا تھا جسے دیکھو "بیگم" کی طرف عجب طائرانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ بیگم تھیں کہ قدم قدم پر کٹی جا رہی تھیں۔ ہزار ہا قسمیں کھا کھا کر بھابی کو اپنی "بیگناہی" کا ثبوت دینے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن بھابی کہاں اس "شاعرانہ انکسار" میں آنیوالی "اے لو بیوی! یہ بھی کوئی چھپانے کی بات ہے۔ اللہ کل کے لاتے آج ہی وہ دن دکھائے تم دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو..... نا...... نا ایسی باتوں میں مذاق اچھا نہیں ہوتا۔"

مختصر یہ کہ بیگم کی تمام "صفائی" بیکار ہو گئی۔ بھابی نے امی جان کو یقین دلا دیا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ ذرا امیدوائف بلائی گئی۔ لیکن شاید کمبخت کو بھابی سے عداوت تھی۔ فیصلہ بھابی کے خلاف ہوا۔ یعنی "کوئی بات نہ تھی" بیگم اس مذاق سے پورے

آٹھ دن تک مجھ سے مُنہ چھپائے رہیں ۔

آئے دن ایسا ہی ہوتا رہتا ۔ سارے گھر کا ناطقہ بند تھا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی جو کچھ بولتا ۔ کیونکہ بھابی کی یہ صحافتی خدمات سچائی اور خلوص میں ڈوبی ہوئی تھیں ۔ یعنے ان میں "استادشہ" سے پرخاش کا خیال بالکل نہیں ہوتا تھا " دوسرے یہ کہ "کچھ شاعری ذریعہ عزت نہ تھی انھیں" مطلب یہ کہ ان کا وہ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن "کسی بیوپار کی صورت نہیں تھا ۔ بلکہ خالصاً لوجہ اللہ ۔ یہی وجہ تھی کہ بیگم تک کو ان کی "گزارش احوال واقعی" اکثر منظور کرنا پڑتی ۔ جب کبھی مقطع میں کوئی "سخن گسترانہ" بات آجاتی ۔

ہاں تو ایک روز ہوا یہ کہ میں اپنے کمرہ میں خاموش بیٹھا ہوا اپنے کچھ پرانے خطوط اور البم کی تلاشی لے رہا تھا کہ ناگاہ یا قضائے کار نمودار ہوئیں بھابی مع اپنی تمام گھبراہٹوں کے ۔ میں جب محبت کے عالم میں تصویروں کے البم سے کھیل رہا تھا ۔ کالج لائف کی پرکیف اور کبھی نہ بھولنے والی زندگی کے دلفریب خواب آہستہ آہستہ فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے ۔

دفعتاً کرسی کے پیچھے سے بھابی نے ہاتھ بڑھا کر تصویروں کا البم جھپٹ لیا میرے چہرہ کو دیکھا اور پھر پیش نظر تصویر کو ۔

"یہ تصویر کس کی ہے ؟"

میں نے بلا تامل عرض کیا ۔

"میری جان و دل کی ملکہ کی"

"یعنی یہ ؟" بھابی نے یا آدرنی کو الگ کرتے ہوئے پوچھا ۔

"یعنی یہی کہ جن کو آپ دیکھ رہی ہیں۔"

"ہاں تو یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ یہ ہے کون۔؟"

"بس یہی۔ کیا نام؟ کہ سمجھ لیجئے میری محبوبہ.....!"

"اچھا تو یہ باتیں ہیں جناب کی"۔ بھابی نے کولمبس کی طرح امریکہ دریافت کر لینے کے انداز میں کہا۔!

"جی ہاں! دل ہی تو ہے"۔ میں نے مصرع پر مصرع لگا دیا۔

"بہت خوب۔ اچھے آپ اور اچھا آپ کا دل۔ آخر یہ ہے کون۔؟"

"لیکن یہ پوچھنے کا آپ کو حق نہیں"

"مگر بتانا تو پڑیگا تم کو" بھابی نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"ہاں تو بتا بھی دوں گا"

"نہیں ابھی"

"اچھا سنئیے۔ لیکن ایک شرط ہے کسی تیسرے آدمی کو یہ باتیں نہ معلوم ہوں۔" میں نے رازداری کا وعدہ لیتے ہوئے کہا۔!

"میری پیاری صفیہ کی"

اتنا سننا تھا کہ بھابی سر ہو گئیں، ولدیت، قومیت، سکونت غرضکہ سب کچھ تو پوچھ ڈالا۔ میں بھی کہنے پر تلا بیٹھا تھا۔ عرض کرنا شروع کر دیا۔ پچھلے دنوں جب میں دہلی گیا تھا تو "صفیہ" سے ملاقات ہوئی ریل میں۔ وہ بھی کیسے کہ میں نگاہوں کے راستے دل کھو چکا تھا۔ ان کے حسن و جمال نے مجھے اپنا لیا۔ علیگڑھ میں پڑھتی ہیں۔ بہت شریف ہیں۔ آہ۔! گویا میں کسی ڈرامے کے "ڈائیلاگ" بول رہا تھا۔ لیکن۔ لیکن بھابی خدا کے

لئے آپ کو میری جان کی قسم کبھی سے کہہ نہ دیجئے گا“ میں نے کئی ٹھنڈی سانسیں بھر ڈالیں
”نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میری ایسی عادت ہی نہیں۔ جو لگائی
بجھائی کرتی پھروں“

بھابی نے البم واپس کرتے ہوئے میرے چہرہ پر عشق کے آثار دیکھے۔ شاید
میں صفیہ کی محبت میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی ایسا معلوم ہوا کہ
”ہم دلی سے بول رہے ہیں“۔ ”جی ہاں یہ دلی ہے“۔ یعنی برابر کمرہ میں بھابی کا پروگرام
شروع ہو چکا تھا۔ بیگم ساون بھادوں کی طرح امنڈ امنڈ کر رو رہی تھیں۔ بھابی میری
محبت کی المناک کہانی بیان کر رہی تھیں اور بیگم کے آنسو بھی پونچھ رہی تھیں۔ صحن میں
جو پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سارا گھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بالکل اسی طرح مجھے بھی دیکھ رہا تھا جیسے
کسی دن بیگم دیکھی گئی تھیں۔ بھابی باورچی خانہ میں بوا نصیبن سے رازداری کے فرائض انجام
دینے میں منہمک تھیں۔

”بہن۔ تمہیں بتاؤ۔ اے میری جوتی کو کیا غرض جو زمانے بھر سے کہتی پھروں کہ
ان کو صفیہ۔ جلی موئی صفیہ سے محبت ہے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ کسی سے کہئیے
گا نہیں۔ تو میں کیوں کہنے لگی۔ ہاں جو کچھ بے چاری دلہن کے نصیب میں لکھا ہے
ہوگا۔ اور ہو کر رہے گا“

بوا نصیبن جیسا صابر و شاکر آدمی بھی ”بھابی کے توکل“ کی داد دیئے بغیر نہ رہ

”جی ہاں“ بیگم صاحب! اللہ جو کرے گا ہو گا وہی۔ مگر چھوٹی بیگم کی قسمت“
شاید فرطِ قلق سے وہ بھی زیادہ نہ کہہ سکیں“

اب جو آگے قدم اٹھاتا ہوں تو امّی جان نظر آئیں چھالیہ کتر رہی تھیں۔ سروتہ ہاتھ کا ہاتھ میں رہ گیا وہ دُہائی مچائی کہ توبہ ہی بھلی۔ بھابی تو اسی تاک ہی میں تھیں فوراً موقع واردات پر پہونچ گئیں۔ اور ناصح مشفق بن کر اچھی طرح امی جان کے غصہ کو مشتعل کر دیا۔ چارہ ہی کیا تھا سر لٹکائے ہوئے میں باہر چلا گیا۔

چند دوستوں کے ساتھ آج کھانے اور پکچر کا پروگرام تھا۔ پکچر سے واپسی پر صاحب خانہ سے کھانے کی معذرت کر کے جو گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں بیگم کے کمرہ میں فل بنچ جمع ہے، امّی جان، بھابی، بیگم، اور بھائی صاحب! جان ہی تو نکل گئی۔ واقعی معاملہ خطرناک سے خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا۔ یعنی ان واقعات کی پوری اطلاع بھائی صاحب کو ہو چکی تھی۔ اور بیچاری بیگم کا گریہ بھی ان کو دکھایا جا چکا تھا۔ سارے گھر میں تلاطم بپا تھا۔ بھابی نے اچھا خاصہ بات کا بتنگڑ بنا دیا تھا۔ اور نہایت انہماک و خلوص کے ساتھ سعیٔ بلیغ فرما رہی تھیں کہ میں ڈانٹا جاؤں انہوں نے گھر بھر کو یقین دلا دیا تھا کہ میں صفیہ کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ اگر فوری کاروائی نہ کی گئی تو معاملہ "تیر از کمان رفتہ" ہو جائے گا۔ اور میں یا تو صفیہ سے نکاح کر لوں گا۔ یا پاگل ہو جاؤں گا۔ شادی کر لینے کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اس اللہ بندی کو یقیناً زندہ در گور ہونا پڑے گا۔ جس کو کچھ کم سوا لاکھ "سکّہ رائج الوقت" کے بدلے ہیں میں نے اپنے نکاح میں قبول کیا ہے۔ کپڑے بدل کر جب میں عدالت عالیہ کے سامنے پیش ہوا تو بھائی صاحب نے "وہ تصویر" میرے سامنے رکھ دی۔

"یہ کس کی تصویر ہے۔"

اب واقعی معاملہ زیادہ اُلجھ گیا تھا۔ بات بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ میں نے عرض کیا۔

"بھابی ہی سے پوچھ لیجئے"

بیچاری بھابی تو ایسے فی سبیل اللہ کاموں کی منتظر ہی رہتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے پوری داستانِ محبت دُہرادی۔ اور ساتھ ہی ساتھ عورتوں کے "بین الاقوامی حقوق" کی جو ذمہ داری ان پر عاید ہوتی تھی۔ اس کی بھی ترجمانی کرتے ہوئے بیگم کا دکھ درد بھی بیان کر دیا ابھی "الف لیلہ" کا آخری باب بھی ختم نہ ہوا تھا کہ ہر چہار طرف سے بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے تو امی جان نے اپنا پچا کھچا "خطبۂ صدارت" ختم فرمایا۔ پھر بھائی صاحب نے مولوی نذیر احمد صاحب کی "الحقوق والفرائض" سنائی۔

میں تھا کہ ساکت وصامت کھڑا ہوا سب کچھ سُن رہا تھا۔ بھابی اس طرح خاموش کھڑی تھیں جیسے ان واقعات سے ان کو کچھ واسطہ ہی نہیں۔

"ملزم" کے بیان کی باری تھی۔ بھائی صاحب مجھ سے سننا چاہتے تھے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرے پاس جواب ہی کیا تھا۔ میں نے جیب سے ایک خط نکال کر پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

"بات صرف اتنی تھی۔ بھابی کو غلط فہمی ہوئی سہیل کی یہ تصویر پچھلے سال کالج کے ڈرامہ کی ہے جو اس نے مجھ سے منگوائی تھی۔ بھابی سر ہو گئیں تو پھر میں کیا کرتا۔"

بھائی صاحب نے پہلے خط کو آہستہ پھر زور سے پڑھا لکھا تھا۔

پیارے جمشید!

پچھلے سال کالج میں جو ڈراما ہوا تھا اس میں میں نے صفیہ کا فیمیل پارٹ (Female) ادا کیا تھا ہیروئن کی حیثیت سے میرا پارٹ بہت کامیاب رہا تھا جس کی ایک تصویر میں نے تم کو بھیجی تھی۔ میرے پاس اس

کی کوئی کاپی نہیں ہے اگر تمہارے پاس ہو تو بھیجدو۔ اس کی دوسری کاپی کروا کے واپس کردوں گا۔

تمہارا سہیل (صفیہ)

بھائی صاحب نے خط پڑھکر تصویر اور خط میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ آج کل کے لڑکے میں کہتی ہوں کتنے شریر ہوتے ہیں۔" امّی جان پائنچے دبائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ بھابی سوالیہ نشان بنی ہوئی رہ گئیں ہنسی ہنس رہی تھیں اور میں بیگم کو منانے میں مصروف تھا۔

بھلے آدمی

چھوہارے پر ـــــ فتحپوری ـــــ چاندنی چوک!

جس طرح کسی ووٹر کو دیکھکر امیدواروں کے ورکرز ووٹ چھین لینے کے لئے دوڑتے ہیں ـــــ بالکل اسی طرح تانگے کے اڈوں پر سواریوں کو دیکھ کر ہلچل مچ جاتی ہے ـــــ ہر تانگے والا یہی چاہتا ہے کہ جلدی سے جلدی سواری بٹھاکر اپنا تانگہ بڑھا دے۔

"برقعہ پوش عورت دھیرے دھیرے تانگوں کے اڈے پر پہونچ چکی تھی ـــــ تانگے والوں نے گھوڑوں کی راسیں تاننا شروع کردیں ـــــ!

"آیئے ـــــ میں جارہا ہوں۔"

"ادھر آیئے کہاں جانا ہے ـــــ آپ کو۔"

"بیگم صاحب ـــــ فرسٹ کلاس ہے تانگہ۔"

"اس تانگے پر ـــــ ادھر کہاں جارہی ہیں ـــــ آپ۔"

مجیدا کے دماغ پر ایک زور سے گھونسہ لگا جیسے ـــــ تاڑی کے نشے میں چور آنکھیں چمکنے لگیں ـــــ یہ کل کا لونڈا سلامت ـــــ میری سواری کو ہتھیا لے ـــــ جانتا نہیں کہ وستاد مجیدا سے دشمنی مول لینا عقل داروں کا کام نہیں ـــــ

تاڑی کے نشہ میں وہ بدمست ہو رہا تھا —— للکارا !

"وہ جا بے لونڈے —— ہوش کی باتیں کر —— جانتا نہیں —— میں

ہوں وستاد مجیدا "

"ہاں ہاں جانتا ہوں —— سلامت نے بے پروائی سے جواب دیا —

تو وستاد ہو گا جس کا ہو گا —— میرا کیا بگاڑ دے گا "

" میں کہتا ہوں " —— مجیدا بولا —— " سلامت کے بچے، تو میری

سواری کو کیوں ورغلا رہا ہے "

" ابے مجیدا کے بچّے —— " سلامت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا - آج کچھ

زیادہ تو نہیں پی گیا —— جو اتارنا پڑے نشہ مجھے "

" زبان نہیں رُکتی تیری —— بتادوں آکر تجھے —— " مجیدا نے آستینیں

چڑھالیں —— !

" ابے چل —— اپنا کام کر —— " سلامت کہنے لگا " بنا پھرتا ہے

وستاد کی دُم —— بیگم صاحب آجاؤ کہاں جانا ہے —— " !

نہیں سنتا حرا...... ! ...... ! مجید اکڑھا - آتا ہوں -

قریب تھا کہ سلامت بھی اپنے تانگے سے نیچے اُتر آئے - اور موٹی موٹی

گالیاں چابکوں کی بوچھاڑ میں کھو جائیں " برقعہ پوش " عورت لپک کر " سلامت "

کے تانگے پر پہنچ گئی —— وہ مظلوم تھا —— ساری خطا مجیدا ہی کی تھی —— برقعہ

پوش عورت نے یہی سمجھا شاید !

چل بیٹا ! سلامت نے راسیں تان دیں —— کہاں جائیں گی آپ ؟

جائیں گی کہاں — شکست خوردہ مجیدا نے اپنے انتقام کی پیاس بجھانے کیلئے لقمہ دیا — وہیں گوروں کے پاس اور کہاں! اپنے یاروں میں —!

تانگہ بڑھ چکا تھا برقعہ پوش عورت جھیپے ہوئے لہجہ میں بولی "نئی دہلی سے پرے"

سلامت نے آہستہ سے چابک مار کر گھوڑے کی رفتار اور تیز کر دی — مجیدا کھسیائی ہوئی ہنسی ہنس رہا تھا کھڑا۔ گالیاں بک رہا تھا تاڑی کے نشے میں بدمست — یکایک تانگے پر بیٹھتے ہوئے کسی نے کہا۔

"نئی دلی"

اس نے مڑ کر دیکھا — زنانی سواری تھی۔ بالکل تنہا! اس کے دماغ پر اب بھی سلامت ہی کا خیال مسلط تھا۔ گھوڑے کی باگ موڑتے ہی وہ نئی دلی جانیوالی سڑک پر آ چکا تھا۔

تانگے کے پہیوں کی طرح سے اس کا دماغ بھی چکر کھا رہا تھا — یہ کل کا چھوکرا — حرامی۔ کمینہ۔ جانتا نہیں کہ وستاد مجیدا والدار تک سے نہیں ڈرتا — آج تک تو کسی سے دبا نہیں میں — پولیس والے —، کومٹی "رکمیٹی" والے بھی جانتے ہیں کہ وستاد مجیدا کھون پانی ایک کر دینے والا آدمی ہے — اور — اور — او.....!

لاری ڈرائیور نے پیچھے سے ہارن دیا — مجیدا جیسے چونک پڑا — داہنی طرف تانگہ کو موڑتے ہوئے اس نے ایک چھچھلتی نظر پیچھے بیٹھی ہوئی زنانی سواری پر ڈالی۔ جس کے برقعہ کا نقاب ہوا میں لہرا رہا تھا۔

بیگم صاحب! وہ کہنے لگا۔ یہ لاری والے بھی بڑے پاجی ہوتے ہیں

—— وسدن ایک تانگے سے لاری لڑادی ایک نے۔ سواریاں تو بچ گئیں —— پر —— پر۔ تانگے کے پرخچے اڑ گئے —— جیسے یہ سڑکیں ان کے باپ کی خریدی ہیں —— اور ہم لوگ جو ہر سال کمیٹی کو ٹیکس دیتے ہیں —— بیس روپیہ سال —— اور پھر —— پولیس اور کمیٹی والوں کی بیگار الگ۔ پر غریبوں کی کون سنتا ہے بڑے آدمیوں کا راج ہے آج کل۔

سرکار —— مہنگائی کا یہ حال ہے —— کہ تانگے کی ربڑ جو دو روپیہ فٹ ملتی تھی پہلے، اب چھ روپیہ فٹ بکتی ہے —— دانہ پہلے نو روپیہ بیس آنے میں آتا تھا —— سرکار! اب —— اب —— یہ جان لیجئے کہ پورے پانچ روپیہ روز میں گھوڑی کا پیٹ نہیں بھرتا —— کوئی بال بچوں کو کیا کھلائے۔

"برقعہ پوش" عورت خاموش بیٹھی ہوئی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے تانگے والے کی باتوں میں کوئی مزا ہی نہ تھا۔

مجیدا تیز تانگہ ہانکتا ہوا بکتا چلا جا رہا تھا —— سڑک پر غیر معمولی بھیڑ تھی —— سینما کا مٹنی شو آج ذرا کچھ دیر سے ختم ہوا تھا —— شائد لڑائی کی ریل کچھ لمبی تھی۔ سیکڑوں آدمی آنکھیں ملتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکراتے چلے جا رہے تھے۔ مجیدا چلا رہا تھا۔

ہٹو —— بچو!

بابو جی —— بابو جی!

سردار جی —— بابو جی!

دور پکچر ہاؤس سے نکلتے ہوئے تماشائی —— پردۂ فلم پر ناچتی ہوئی تصویروں کی طرح ناچ رہے تھے۔ تصورات کی دنیا میں —— تخیلات کی دنیا میں —— ہر شخص

دیکھی ہوئی تصویر پر ہلکے زنی کر رہا تھا اور بعض منچلے ہلکے ہلکے سروں میں سُنے ہوئے گانوں کی دھنیں اپنے گلے میں اتار رہے تھے۔

"اچھا جی ــــ اچھا جی ــــ ہماری گلی آنا ــــ اچھا جی "

"ہماری گلی آنا ــــ اچھا جی "

"ہمیں نہ بھلانا ــــ اچھا جی ــــ اچھا جی!"

"شہر کی لونڈیا ــــ شہر کی لونڈیا"

"اچھا جی ــــ ہماری گلی آنا!"

"ہمیں نہ بھلانا ــــ اچھا جی ــــ اچھا جی "

تانگہ بھیڑ کو چیرتا ہوا اچھلا جارہا تھا ــــ جیسے کوئی تیراک ندّی کی موجوں میں دونوں ہاتھوں سے راستہ کر رہا ہو۔ پکچر ہاؤس کے لمبے چوڑے سائن بورڈ مسکرا رہے تھے۔ فلمی پریوں کی خاموش تصویریں مسکرا رہی تھیں اور تانگہ آہستہ آہستہ چلا جارہا تھا۔

ہٹو ــــ بچو ــــ مجیدا نے کہنا شروع کر دیا۔

میں اگر بائیسکوپ نہ دیکھوں ــــ تو نیند ہی نہیں آتی ــــ چوّنی روز کی بندھی (ہچکی) ہوئی ہے! بس ــ پر (ہچکی) اب تو کوئی اچھا تماشہ آتا ہی نہیں (ہچکی) ــــ ایکدن ــــ ایک دن ــــ چھوہارے پر (ہچکی) میں نے دیکھا تھا ایک تماشہ (ہچکی) بس آپ سے کیا کہوں! میری چوّنی (ہچکی) تو جدھی (جبھی) وصول ہو گئی (ہچکی) جب وس نے وس لونڈیا کو چٹاخ (ہچکی) پٹاخ کیا۔

مجیدا نے چپکے سے مڑ کر سواری پر نظر ڈالی جس کے برقعہ کا نقاب ہوا میں لہرا رہا تھا۔

کناٹ پلیس سے نکلتے ہوئے اُس نے دیکھا ــــ دیکھا کہ سلامت کا تانگہ کوئی آدھ فرلانگ پر جا رہا ہے ــــ اے ۔ آر ۔ پی کے شیڈز کے نیچے بجلی کے بلب نگاہیں جھکائے ہوئے جھانک رہے تھے ۔ ہلکی ہلکی مدھم سی روشنی چاند کی سفید روشنی میں کھو سی گئی تھی ــــ سلامت کا تانگہ "فروٹ" چلا جا رہا تھا موٹروں کی زد سے بچتا بچاتا ــــ تانگے کے پیچھے بیٹھی ہوئی برقعہ پوش عورت نے اپنے چہرہ کا نقاب اُلٹ دیا تھا ۔ واقعی کتنا جھنجھٹ ہیں یہ آج کل کی نقابیں بھی ــــ ساری دنیا نقاب کے جال میں چکراتی دکھائی دیتی ہے ــــ نقاب کی مہین جالی گھنی پلکوں میں اُلجھ جاتی ہے اکثر ــــ اور جو نقاب ہوا میں اڑنے لگے تو پھر ــــ بالکل بیکار !

سلامت ــــ ٹخ ۔ ٹخ ۔ ٹخ کر رہا تھا ۔ مجیدا کے کانوں میں یہ صدا پہنچی ــــ اس کا گھوڑا "ڈلکی" جا رہا تھا ــــ ایک چابک مار کر اس نے راسیں تان دیں ــــ بے زبان گھوڑے کی رفتار تیز ہو گئی ــــ مجیدا تن کر بیٹھ گیا ۔

"بھینا" کوے جا رہا ہے سالا ! قرم کہیں کا ــــ کمائی کھاتا ہے ــــ کمائی ــــ بھینا کی کمائی !

مجیدا کی آواز ہوا میں بھر آ رہی تھی ــــ اور چاند کی ہلکی ہلکی شعاعیں اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں ۔ اس نے تانگے کے پہیوں میں چابک لگا دیا ۔ آواز آنے لگی ؛

ٹر ۔ ٹر ۔ ٹر ۔ ٹرا ۔ را ۔ را ۔ ٹرا !

پیچھے بیٹھی ہوئی برقعہ پوش عورت نے جھک کر پہیوں کی طرف دیکھا ــــ اور یکایک نقاب الٹ دیا ۔

سلامت کا تانگہ قریب آچکا تھا ـــــ مجیدا نے آنکھیں پھاڑ کر سلامت کے تانگے پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کبھی اس نے عورت کو دیکھا ہی نہیں ہے.

اچانک اس کی نظر سلامت پر جا پڑی ـــــ اور تاڑی کا نشہ پھر عود کر آیا۔!

"چل بیٹا" گھوڑے کو اس نے ڈانٹ بتائی۔

سلامت اپنے تانگے پر گنگنا رہا تھا۔!

"مہنگی کا زمانہ ہے!"

"اے دل کہاں لیجاؤں ـــــ مہنگی کا زمانہ ہے!"

"ہاں۔ ہاں ـــ مہنگی کا زمانہ ہے!"

مجیدا کی آنکھوں میں پھر چمک پیدا ہو گئی۔

"ابے قلطبان بھینا ـــــ کو سے لئے جا رہا ہے ـــــ گوروں میں مت کمائی کھاتا ہے ـــ!"

اب سلامت نے بھی مڑ کر دیکھا ـــــ مجیدا بک رہا تھا اول فول۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"وستاد ـــــ مانو گے نہیں ـــــ اتار دوں گا ـــ تاڑی کا نشہ ابھی ـــ"

"اور یہ کیا ـــــ تو اپنی ماں کو سے لئے جا رہا ہے گوروں میں"

ہوا کی سنسناہٹ میں سلامت کی آواز کھو گئی شاید ـــــ مجیدا پوری بات نہ سمجھ سکا۔ کہنے لگا۔

ہاں ـــــ ہاں! بھلے آدمی یہی کرتے ہیں ـــــ نا! جو تو کر رہا ہے ـــــ

قلطبانی ـــ قرمی!

سلامت کا تانگہ تیزی کیساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کیونکہ مجید اکے تانگے کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ اور وہ شائد داہنی طرف سے کتنا کر اپنا تانگہ آگے نکال لینا چاہتا تھا ـــ کتنی سُبکی تھی اس میں سلامت کی ـــ اور اس کے سبزے کی ـــ جس کو اس نے ابھی حال ہی میں بارہ سو کا خریدا تھا ـــ سب مِلا کر دو ہزار سے زیادہ خرچ ہوئے تھے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ مجیدا اپنا تانگہ بڑھا کر نکال لیتا۔

دونوں تانگے تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے ـــ چاروں طرف سناٹا تھا ـــ البتہ کبھی کبھی کوئی موٹر تیزی سے ہارن بجاتی ہوئی نکل جاتی ـــ یا کوئی آدمی سائیکل پر ـــ!

بڑی سڑک سے نکل کر سلامت نے اپنا تانگہ ایک سنسان سڑک کی طرف موڑ دیا ـــ مجیدا کا تانگہ بھی پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ تانگے پر بیٹھی ہوئی سواریاں بالکل مطمئن تھیں کہ ٹھیک راستے پر جا رہی ہیں ـــ مجیدا کا نشہ اب کچھ کچھ اتر چلا تھا اور وہ دھیمے دھیمے سُروں میں گنگنانے لگا تھا۔

آئے بھی وہ ـــ گئے بھی وہ ـــ ختم فسانہ ہوگیا۔

آئے بھی وہ ـــ آئے بھی وہ۔.........!

سڑک کے دونوں طرف میدان تھے ـــ شائد یہ ویرانے پارکوں کی شکل میں بدل دئے گئے تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے نیچے ہرے ہرے لان پر چاند کی شعاعیں پتوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔

دونوں گھوڑے دوڑتے دوڑتے تھک گئے تھے۔ اس لئے ان کی رفتار

میں خود بخود کچھ آہستگی پیدا ہو گئی تھی۔

سلامت کے تانگے پر بیٹھی ہوئی برقعہ پوش عورت نے آہستہ سے کہا۔ ”رک جاؤ ——“

سلامت نے کنارے کی طرف تانگہ روک دیا —— اس نے آہستہ آہستہ سلامت سے کچھ اور کہا۔ جانے کیا۔ پارک کے اندر اندر وہ کنارے کنارے چلنے لگی۔

مجیدا کا تانگہ بھی وہیں قریب ہی آکر ٹھہر گیا۔

یہیں ٹھہرو —— آتی ہوں ابھی —— اس نے اپنا برقعہ اتار کر تانگے پر رکھ دیا اور اسی پارک میں چلی گئی۔

مجیدا نے دیکھا —— پارک میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی —— قد آدم جھاڑیوں پر گلابی نیلے اور کاسنی پھول چاندنی میں ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ جن کے پاس ہی پڑی ہوئی لوہے کی بنچوں پر قہقہے کھیل رہے تھے۔ سنہرے قہقہے۔ کچھ پھیکے سے ——!

سلامت نے جیب سے بیڑی کا بنڈل اور ماچس نکالکر —— ایک بیڑی سلگائی مجیدا اب تک پارک ہی کی طرف دیکھ رہا تھا —— ماچس کی روشنی نے یکایک متوجہ کر لیا —— اس نے مڑ کر سلامت کی طرف دیکھا آج تاڑی کے نشہ میں وہ بیڑی کا بنڈل بھی بھول گیا تھا —— سلامت کے منہ سے دھوئیں کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

خود بخود مجیدا کو جماہیاں آنے لگیں۔

”لانا —— ایک بیڑی ادھر کو ——“ مجیدا بولا۔

سلامت نے بیڑی اور ماچس نکال کر بڑھا دی مجیدا کی طرف ۔ اور مُنہ پھیر کر دوسری طرف دھُواں اڑانے لگا ۔ مجیدا نے بیڑی سُلگا کر ماچس واپس کرتے ہوئے کہا ــــ !

آج تو میں بالکل " ڈُون " ہو گیا تھا ــــ بہت پی لی تھی ! کوئی چار گھنٹے ! جانے کتنی دیر لگے گی ۔ میں تو گیارہ بجے کھول دیتا ہوں ــــ " پر مزدوری اچھی ملتی ہے ان سے ۔

سلامت نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

مجیدا کہنے لگا ۔

ہم کو کیا ــــ کوئی کچھ کرے ــــ یہاں اپنی مزدوری سے غرض ۔ سلامت نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا ــــ مجیدا اپنے تانگے کی اگلی سیٹ پر آ کر لیٹ رہا ۔ سلامت نے پہلی بیڑی ختم کر کے دوسری بیڑی جلائی اور وہ بھی اپنے تانگے پر چلا گیا ۔

کئی منٹ تک موت کی ایسی خاموشی چھائی رہی ــــ شاید مجیدا کی آنکھ لگ گئی تھی ۔ یکایک چونک کر بولا ۔

کیا بجا ہوگا سلامت ؟

سلامت گو جاگ رہا تھا مگر کچھ نہ بولا ۔

سلامت ! مجیدا نے پھر پکارا ــــ کیا سو گیا ؟

کیا بکواس لگائی ہے ــــ سلامت نے جھنجھلا کر کہا ۔ چپکے کیوں نہیں رہتے !

آدمی ہے یا جانور ــــ مجیدا بولا ــــ بات کا جواب کیوں نہیں دیتا ۔

تیری بات کا کیا جواب دوں! ـــــ سلامت نے کہا ـ تو تو ـــــ "ین ڈون" ہے۔

پی تو گیا تھا زیادہ ـــــ مجیدا نے جواب دیا ـ پر اب نشہ نہیں۔

وستاد ـــــ سلامت کہنے لگا۔ آج تم نے گالیاں دی ہیں۔ یاد رکھنا ـــــ وستاد!

"کون ـــــ میں نے! مجیدا بولا ـــــ تم کو گالیاں دیں میں نے! کون کہتا ہے! جھوٹ شائد نشے میں ایک آدھ بات نکل گئی ہو منہ سے ـــــ جانے بھی دے! بھلے آدمی برا نہیں مانتے ایسی باتوں کو ـــــ ہاں یہ تو بتا مزدوری کیسا طے ہوئی!

"میں نے تو کچھ طے وَے نہیں کیا ـــــ سلامت نے کہا۔ پر پیسے اچھے ہی ملیں گے!

اچھا بیڑی پلا ایک! مجیدا نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا ـــــ یہ خانگیاں تو چاوڑی کی رنڈیوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ سچ پوچھو تو ـــــ!

ہو گا ـــــ سلامت بولا! ہمیں تو اپنے پیسوں سے کام......!

چاند کی دھیمی دھیمی روشنی تانگوں کے اندر جھانک رہی تھی ـــــ اور سامنے پارک کی لان پر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جھاڑیوں کی چھاؤں میں سائے پریڈ کر رہے ہیں ـــــ!

لفٹ ـ رائٹ ـ لفٹ ـ رائٹ ـ لفٹ ـ رائٹ ـ کوئیک مارچ ـــــ!

کچھ ہلکی ہلکی سی آوازیں اور قہقہے فضا میں گونجتے معلوم ہو رہے تھے۔ دھیرے دھیرے دو سائے پارک کے اس سرے پہ آتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں گھاس پر تیر رہے تھے۔ نگاہوں میں ایک بےحجابانہ چمک۔

دونوں تانگوں کے قریب آ چکی تھیں —— ملگجی ساریاں برقعوں میں چھپائی جا رہی تھیں —— الجھے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے —— اور سلامت ہلکے ہلکے سُروں میں گا رہا تھا۔

مہنگی کا زمانہ ہے —— اے دل کہاں لیجاؤں!

اے دل کہاں لیجاؤں مہنگی کا زمانہ ہے —!

ٹھوکے

"لڑکیوں کے اب دفعان ہو چکو —— یہاں سے؟"

سچ مچ ہم لوگوں کے کان پھوٹنے لگے — امّاں بی کہہ رہی تھیں خالہ بی کمرے میں چوکے پر بچھی ہوئی چاندنی بدلکر موٹے موٹے گاؤ تکیوں کے غلاف درست کر رہی تھیں۔ اور ہوتا بھی یہی تھا کہ جس دن کوئی مہمان آنیوالا ہوتا سارے گھر کی مداوُور ہالنگ، کرنا پڑتی۔ چوکا کبھی کمرے سے دالان میں کبھی دالان سے کمرے میں لایا جاتا۔ سنگھار میز آئینہ کے کمرے سے صحنچی میں اور کبھی تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے صحن میں۔ پلنگ کبھی اتر سے دکھن اور پورب سے پچھم بچھائے جاتے۔ اور کبھی اپنی اصلی جگہ پر لاکر اس طرح دیکھے جاتے جیسے ان کی پہلی روش میں زیبائش کی زیادہ جاذبیت اور کشش تھی۔ پاندان اگالدان، ہاتھ دھونے کی سلفچی، گھڑوں کے بجھرے، شیشوں کے جاپانی گلاس، پیودے اور چلمنیں، کرسیوں کے گدے سب کے سب "انقلاب زندہ باد" پکارنے لگتے البتہ ہم لوگوں کی کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان رحل کلام پاک سمیت ہم لوگوں کی تعلیم کے پروپیگنڈے کے لئے بالکل اسی طرح برآمدے میں سج دیا جاتا جیسے دکاندار اپنی کان کا بیش قیمت سامان دکھاوے کے لئے شوروم میں سجا دیتے ہیں —— اور —— اور یہ سب کام مجھے، آپا اور بچاری بجّو ہی کو کرنا پڑتے۔ پھر خالہ جی کے کوسنے ——— رہی

نہیں جھکتیں ـــــ مُوا یہ گھر ہے کہ میونسپلٹی کا کوڑے خانہ ـــــ میری جوتی سے ـــــ اے لو! ـــــ جیسے موا میرا ہی پیام آنیوالا ہے ـــــ میں تو کہتی ہوں، اس چودہویں صدی کی لڑکیاں ـــــ اے نوج ہم ایسے ہوتے اسے ہے بیوی اس زمانے کی لڑکیاں۔ توبہ توبہ دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے ان کی۔ خدا کی پناہ برابر دیدہ سے دیدہ لڑائے رہتی ہیں ـــــ اللہ کی مار مُردیوں کی صورتوں پر۔ پڑی رہو گی جنم بھر یونہی ـــــ کوئی پوچھے گا بھی نہیں"

اماں بی کا ہے کو خاموش رہتیں آخر تھیں تو بہن ہی خالہ بی کی کہنے لگیں۔ "نابہن! میں نے تو ایسی لڑکیاں دیکھی ہی نہیں ان کا بوجہ سب سے اونچا۔ نگوڑیاں آج کل والی۔ توبہ الٰہی اگر ہم لوگوں کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے تو اماں جان زندہ ہی دفن کر دیتیں۔ مگر اب دیکھتی ہوں نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ شرم و حیا چھو تک نہیں گئی۔ گن ڈھنگ ایسے کہ آفت پیٹیوں کو کوئی پاس بھی نہ کھڑا ہونے دے اور پھر یہی تو ہے کہ ہم لوگ جھینکتے ہیں اور کمبختوں کا ٹھکانا نہیں لگتا۔ زندگی اجیرن ہے ـــــ الٰہی توبہ ـــــ بار الٰہا ایسی زندگی سے موت دیدے۔

گویا اس میں ہمیں سب کا قصور تھا کہ ہم لوگوں کے بیاہ نہیں ہوتے۔ پیام آتے ہیں تو طے نہیں ہوتا لڑکے والے وان جہیز مانگتے ہیں۔ میٹرک اور بی۔ اے کے سرٹیفکیٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ بڑی لڑکی شکل وصورت کی تو اچھی ہے، مگر ذرا عمر زیادہ ہے۔ ہاں منجھلی کا ذرا قد چھوٹا ہوتا تو ـــــ اور چھوٹی ذرا مطلب یہ کہ کالی ہے ذرا سانولی۔ اماں بی اور خالہ بی طرح طرح کی "کنوینسنگ" (Convincing) کرتیں رضو کی عمر ہی کیا ہے ابھی۔ بیوی سچ پوچھو تو ابھی میرا ارادہ ہی نہیں ہے کرنے کا۔

— لیکن، وہ، اپنی بیماریوں کی وجہ سے بہت گھبراتے ہیں۔ ویسے پیام تو بہت آئے اور آج بھی آتے ہیں مگر کچھ حسب ونسب کا جھگڑا پڑ جاتا ہے — بہن میں تو کہتی ہوں لڑکا چاہے غریب ہی کیوں نہ ہو مگر خاندانی ہو —"

"ہاں صاحب!" خالہ بی تائید مزید فرماتیں۔ ہم کو تو اور کچھ نہیں چاہیئے بس خاندان اچھا ہو۔ کھاتا پیتا —"

"جی ہاں۔ مڈل تو چھوٹی بھی پاس کر چکی ہے۔

منجھلی کے لئے — تو اچھے بھائی بہت زور دے رہے ہیں اپنے جاوید کیلئے۔ اللہ رکھے اسی سال تو اس نے وکالت پاس کی ہے"

"نا بیوی! چھوٹی تو ابھی بہت کم سن ہے اور پڑھ بھی رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ تو ٹھیکرے کی منگی ہے اپنے ماموں کے گھر۔ لڑکا ڈپٹی کلکٹری کا امتحان دینے والا ہے"

"کئی برس سے کانپور کے محسن علی صاحب رضو کیلئے کہہ رہے ہیں۔ ان کا ایک ہی لڑکا ہے اور جائداد بہت کچھ ہے۔ گاؤں گراؤں، کوٹھیاں مکانات سبھی کچھ مگر دولہا بھائی راضی نہیں، لڑکا فوج میں نوکر ہے شائد کپتان ہے۔

اے ہے بیوی! چائے میں کونسا ہرج۔ آپ تو بڑا تکلف کرتی ہیں۔ یہ تکونے اور سہال تو یونہی رکھے ہیں لیجئے بسم اللہ۔"

"ہمیں معاف کیجئے گا۔ ہمارے یہاں یہ دستور نہیں ہے جب ایسی بات چیت کیلئے جاتے ہیں، تو نمک تک نہیں چھوتے۔"

"واہ بھئی واہ! یہ آپ کے یہاں کی نرالی رسم ہے وہ تو آپ ہی کی لڑکی

ہے ۔ اب یہ باتیں پرانی ہو چکیں ۔"

" جی ۔ لڑکی ۔ لڑکی دکھانے میں تو کوئی عذر نہیں ۔ وہ تو آپ ہی کی ہے مگر ہمارے یہاں اسکو عیب سمجھا جاتا ہے ۔"

" اے ہے تو اس میں کونسا ہرج ۔ عیب تو جب ہوتا جب میں کسی غیر جگہ سے آئی ہوتی ۔ ہم آپ ایک ہی جگہ کے رہنے سہنے والے ۔ پر میں نے تو اسے جب وہ چھوٹی سی تھی دیکھا بھی ہے ۔ اب بہت دنوں سے نہیں دیکھا ۔"

" نا بہن اس معاملہ میں آپ ضد نہ کریں "

" اچھا خیر جانے دیجئے ۔"

بجّو نے آپا کے ٹہو کا دیا ۔

" جاؤ تمہارا پیام آیا ہے ۔"

" منو ۔ نہیں ۔ میری نہیں ! تمہاری بات چیت ہے ۔ وہ جو ابھی کہہ رہی تھیں کہ دو تین سال میں دار العلوم سے پاس کر کے فارغ التحصیل ہو جائیگا ۔"

" فارغ التحصیل " کو آپا نے قرأت سے ادا کرتے ہوئے کہا ۔

" اے نوج " بجّو بولیں ! میں کاہے کو اس موئے نکھٹو مولوی سے بیاہ کرنے لگی ۔ وہ چڑمی کا غلام آپ ہی کو مبارک ۔"

آپا جھینپ گئیں " تو شاید شفّو کیلئے کہہ رہی ہونگی مولویائن ۔"

میرے تن بدن میں چنگاریاں چھوٹنے لگیں ۔

" اے اُوہی ! میرا جوڑ کیوں ملاتی ہو اُس موئے بن مانس سے ۔ خدا

نہ کرے تم سب کے منہ میں خاک۔ ہوش کی لو۔ چولہے بھاڑ میں جائے موا مولوی اے نوج میرے دشمن۔ اللہ کی مار ٹارزن کے چہیتے پر۔ واہ آپا واہ۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ " دھوبی سے جیت نہ پائیں گدھے کے کان امیٹھیں "

اے اللہ۔ تو میں نے کیا کہدیا۔ جو اتنا بگڑ گئیں۔" آپا دھونس گانٹھنے لگیں کیا تم اجلم بھر یونہی بیٹھی رہو گی۔ بیاہ نہ ہو گا تمھارا۔ پھر اس بیچارے مولوی میں کون سے کیڑے پڑ گئے۔ عاقبت سنبھل جائیگی عاقبت۔ سیدھی جنت میں جاؤ گی۔ بالکل سیدھی۔"

کھی ——— کھی ——— ہی ——— ہی ———

بجو بھوٹ پڑیں۔" کیا اُول فول بکتی ہو ——— فال زبان۔ فال قرآن نگوڑی اپنی بلا اوروں کے سر کیوں تھوپ رہی ہو ———"

آپا نے ایک موٹی سی چٹکی لیتے ہوئے بجو سے کہا۔

"خیر تو کیا ہوا ——— میرا ہی سہی ——— اور تمھارا بھی تو اس دن پیام آچکا ہے۔"

"کہاں سے ؟ کون ؟ " بجو بیقرار ہو گئیں۔

" اے وہی جس کو تم جانتی نہیں! میری ننھی بھولی۔ وہی کچھ کم پچاس برس والا "کھوسٹ" آپا گلنے لگیں۔

" میں کہتی ہوں آپا تم کو ہو کیا گیا ہے۔ اُس موئے بساطی کو کہہ رہی ہو جو ابا جان کی فرزندی میں آنے کیلئے بیقرار تھا۔ اللہ نہ کرے جو میں ——— واہ وا تم نے تو میرا اچھا ہی لے لیا ہے۔"

بجو احتجاج کرنے لگیں۔

"شفو سچ کہنا! اباجان کہہ نہیں رہے تھے اسدن اماں بی سے کہ رفو کے لئے وہ کئی بار آچکے ہیں جو یہاں کے ایک بڑے جنرل مرچنٹ ہیں"

آپا نے مجھے ثبوت میں طلب کرلیا۔

"ہاں بجو کہتی تو سچ ہیں آپا۔ عجائب خانہ کا بجالو کئی مرتبہ آچکا ہے" میں نے سچ سچ بیان کردیا۔

بجو بگڑ گئیں "اے لو۔ سوپ تو سوپ چھلنی بھی بولی جس میں بہتر چھید۔ میری ننو بھی اسی طرف ہو گئیں پہلے تم اپنی خبر لو۔ تمہارے وہ حکیم جی!" آپا کھلکھلا پڑیں۔

"یہ بھی اچھی رہی۔ رو رہی ہیں اس موئے خونّق کو۔ ایسی چاہت بھی کہاں کی پھٹ پڑی تم پر شفو۔ خدا خدا کرو" آپا کہنے لگیں۔

" اے میں کیوں اس میّت کو روتی رونہ رو تم جو اپنے بیاہ کیلئے بیقرار ہو۔ وہ موا سٹرک کوٹنے کا انجن میرے پلے کیوں پڑنے لگا۔ یا تو تمہارے ساتھ ہو گا یا بجو کے ساتھ۔

بجو نے اپنا پورا بوجھ میرے اوپر ڈال دیا "ٹرن کیوں ہوئی جا رہی ہے تیرا بھی ہو جائے گا جلدی ہی کا ہے کی بات"

"آفت پٹیو چپتی نہیں" خالہ بی نے کمرے میں آکر ایک دو ہتڑ مارا تو میری اور بجو کی کمر اور آپا کے ہاتھ پر لگا۔ اور ہم تینوں اوندھے سیدھے ایک دوسرے پر جا پڑے۔"

ابھی ہم لوگ چپ چاپ دم سادھے پڑے تھے کہ ہوائی خطرہ دور ہو جانے کی گھنٹی بجی۔

" اے نکل کیوں نہیں چکتیں اب۔ کیا سب کو سانپ سونگھ گیا؟ "

" خالہ رجز خواں تھیں" اے نوج بہن خدا نہ کرے کسی کی ایسی اولاد ہو۔ اد

ہو بھی تو پیدا ہوتے ہی مر جائیں "۔

" اماں بی قطع کلام کرتے ہوئے دخل در معقولات تک پہونچ گئیں "۔

" اے مجھے تو اس مولویانی کی آتی ہے! آئیں تھیں پیام لیکر جیسے کسی کی لڑکیاں بھاری ہیں جو جھونک دیگا اس جہنّم میں۔ موئے کفن کھسوٹ کہیں کے ۔۔۔ میری لڑکیاں اور ان کا منہ اللہ تیری شان ۔۔۔ "

" نہیں باجی " خالہ بی بولیں ۔ " برا ماننے کی بات نہیں جس کے گھر میں بیری ہوتی ہے ڈھیلے آتے ہیں ۔ "

ہم تینوں بیریاں کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں ۔ تھوڑی ہی دیر میں ابّا جان کھانستے ہوئے داخل ہوئے ۔

" کیا طے کیا رضّو کی ماں "؟

" اے میں کہتی ہوں تم کو ہو کیا گیا ہے ؟ " امّاں بی پانچے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں ۔۔۔ " بڑھبس لگا ہے تم کو ۔۔ تم کو تو یہ لڑکیاں بھاری ہیں ۔ اس موئی مولویانی کو بھیج دیا ۔۔ خدا غارت کرے میرا دماغ چاٹ گئی ۔ اللہ کی مار ۔۔۔ نوج میں اپنی لڑکیوں کو اس مسجد کے ملّا سے بیاہنے لگی "۔

" میں کہتا ہوں کہ ہوا کیا "؟ ابّا جان معاملہ کی تہ تک پہونچنا چاہتے تھے ۔

" ہوتا کیا " اماں بی بولیں ۔ " میں نے صاف صاف جواب دیدیا ۔ کہتی تھیں لڑکیوں کو دیکھوں گی ۔ میں نے کہا ۔۔۔ یہ کبھی نہ ہوگا ۔

" مگر یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا " ابّا جان عورتوں کو ناقص العقل ثابت کرنے لگے اب کل ہی باردو خانہ سے قمر عالم صاحب کی بیوی آنے والی ہیں ۔ وہ تو ضرور دیکھیں

گی لڑکیوں کو۔ لڑکا اچھا خاصہ پڑھا لکھا۔ فیشن ایبل ہے۔ تب کیا ہوگا۔" ؟

"ناصاحب۔ میں لڑکیوں کو سامنے نہ ہونے دوں گی چاہے لاٹ صاحب ہی کیوں نہ ہوں۔"

"میں کہتا ہوں رضّو کی ماں" ابّا جان کہنے لگے۔ تم کو ہو کیا گیا ہے۔ دنیا بدل گئی ہے لیکن یہاں مُرغے کی ایک ہی ٹانگ۔ تم وہی پُرانی لکیر کی فقیر بنی ہو۔ ارے بھئی دنیا کے ساتھ چلو —— دیکھو زمانہ کدھر جا رہا ہے۔ کوئی دمڑی کی ہانڈی لیتا ہے وہ بھی ٹھونک بجا کر پھر یہ تو زندگی بھر کا سابقہ ہے —— ذرا سوچو تو رضّو کی ماں"

آپانے بجّو کے ٹہوکا دیا۔ بجّو نے میرے چٹکی لی۔ اماں بی کچھ اور کہنے والی ہی تھیں کہ خالہ بی ثالث بالخیر بن کر آ پہونچیں ——

"اے ہے دولھا بھائی —— ! میں کہتی ہوں تمھیں بڑھاپے میں ہو کیا گیا ہے۔ تمہاری تو وہی مثل ہوئی" بارہ برس دلّی میں رہے بھاڑ جھونکتے رہے" کہاں سے لے آئے تھے اس مُوئی سوکھے کی بیماری کو۔ کیا یہ لڑکیاں ایسی ہی بھاری ہیں تم پہ۔ اللہ نہ کرے میرے جیتے جی یہ کبھی نہ ہوگا کہ ان کو اس طرح نیگ لگا دیا جائے!"

یکایک خالہ بی کی نگاہ ہم تینوں پر جا پڑی اور محاذ جنگ کا رُخ بدل گیا ہے۔

"بے غیرتو بیٹھی سُن رہی ہو —— چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتیں۔ اے لو ایک یہی باقی تھا۔ کہ باوا اور میّا کی زبانی یہ سب کچھ بھی سن لو —— سو وہ بھی ہو گیا۔ اور میں تم کو کیا کہوں —— دولھا بھائی —— بس جیسی وہ ویسے تم۔ خوب ہی پیوند سے پیوند گُتھا ہے وہ بھی سٹھیا گئی ہیں اور تمھیں بھی بڑبس لگا ہے۔"

مردیو! —— دفن نہیں ہو چکتیں۔ چلو دور ہو میری نگاہوں سے

سامنے سے ــــ ؟

دیکھتے ہی دیکھتے اماں بی باورچی خانہ کی طرف اور اباجان باہری نشست گاہ کی طرف کھسک گئے۔ ہم لوگ شکست خوردہ فوج کی طرح کمرے میں ـــ اور خالہ بی اپنا خطبۂ صدارت مکمل کرتی رہیں ــ!

ایکادشی

راجن پور کے زمیندار گھنشیام سنگھ بڑے خاندانی جنوار ٹھاکر تھے۔ غدر کے زمانے میں ان کے دادا نے کئی لڑائیوں میں نواب برجیس قدر بہادر کا ساتھ دیا تھا۔ جس کی پاداش میں ان کے بہت سے گاؤں گراؤں ضبط کر لئے گئے تھے اور باغی ہونے کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کیلئے "بلیک لسٹ" میں آگیا تھا!

راجن پور اور اس کے آٹھ دس پروے بڑی مشکل سے بچ سکے تھے جن کا انتظام گھنشیام سنگھ کے باپ رام سنگھ کے نام سے ہوا تھا! جو رام سنگھ کی نیک چلنی، خوش سلیقگی اور جانفشانی کی وجہ سے ان کے سارے کنبہ کے بافراغت زندگی کیلئے کافی تھے —

رام سنگھ جتنا معاملہ فہم۔ منصف مزاج۔ سلیقہ شعار آدمی تھا۔ گھنشیام سنگھ اتنا ہی بدچلن۔ بدسلیقہ اور بدکردار انسان ثابت ہوا۔ باپ دادا کی جمع کی ہوئی گاڑھی کمائی بڑی بیدردی سے لٹانے کے بعد زمینداری پر بھی قرضہ ہو چکا تھا۔ سات ہل کی سیر گھٹتے گھٹتے چار ہی ہل کی رہ گئی! بڑے بڑے سرسبز اور گھنے باغ کوڑیوں کے مول بیچکر کٹوا دیئے! پھر بھی گاؤں کے پرانے اور خاندانی چھتری ہونے کی وجہ سے ان کی چوپال میں ہر وقت دس پانچ آدمی جمع رہتے اور برابر ایک آدھ چلم بھری ہی رہتی! اکثر

ٹھاکر اونچے لہجے میں غدر کے زمانے کے سنے سنائے واقعات اور جرمنی کی پرانی لڑائیوں کے قصّے اس طرح بیان کرتے جیسے میدانِ جنگ میں وہ خود موجود تھے! "مہابھارت" کے واقعات کو سچ ثابت کرنے کیلئے اور "ارجن" کے پھینکے ہوئے "بان" کے وجود پر آج کل کے "بموں" اور ہوائی جہازوں کی مثالیں پیش کر کے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی! اپنی گھنی اور لمبی لمبی مونچھوں کو سنوارتے ہوئے وہ کہنے لگتے "اور کیوں نہ ہو وہ اوتاروں کے کرتب تھے یہ منّشوں کے بکھیڑے!

گو ان کے یہاں کوئی باقاعدہ پنچائت قائم نہ تھی لیکن ان کی زمینداری کے تمام مقدمے معاملے اسی چوپال میں فیصل ہوتے جنکو نافذ کرانے کیلئے انہیں کئی بار فوجداریاں کرنی پڑیں۔ بہت سے مقدمے لڑنا پڑے! اور آخر کار ان کی ہیبت چاروں طرف قائم ہی ہو کر رہی۔ ان کے اثر و اقتدار سے پاس پڑوس کے سب لوگ دبتے تھے، خصوصاً چھوٹی قوم والے تو ان کے نام سے اس طرح ڈرتے تھے جیسے قصائی سے گائے یا پولیس کے ظالم عمال سے آبرودار!

گھنشیام سنگھ تھے تو پرانے پاپی! لیکن بڑھاپے میں ان کی حرص ہوس اور بھی بڑھ گئی، جوانی میں نہ جانے کتنی معصوم اور بیگناہ زندگیوں سے وہ کھیل چکے تھے۔ جس کو تاک لیتے اس کی آبرو بچانا مشکل ہو جاتا! انسان کی سیہ کاریاں ذات پات مذہب و ملت میں کوئی امتیاز نہیں کرتیں! یہی حال ان کا تھا ان کے "پاپ" کے آگے شودر تو شودر بڑے بڑے چھتری سرنگوں ہو چکے تھے۔

نہ جانے کتنے دکھی دلوں کی پکار آسمان کی بلندیوں سے ٹکرا چکی تھی لیکن

جب تک دعاؤں کے قبول ہونے کا وقت نہیں آتا آہوں کی تاثیر کام نہیں دیتی۔ ا ٹھاکر کے پاپی جیون کے "آنند دوار" ابھی تک کھلے تھے۔ ان کے گناہوں کی زندگی ایک بھی ہچکی نہ لے سکی تھی۔ انسان کا ضمیر ہے کہ اپنی برائیوں کو بھلائی ثابت کرنے کیلئے مثالوں اور لفظوں کے حیلے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے! مصیبت کی گھڑیوں میں اسے اِس جنم کی کرنی یاد نہیں آتی۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اپنے اگلے جنم کے کئے کی سزا مل رہی ہے۔ یا آئندہ آنیوالی مصیبتوں کی تخفیف کیلئے یہ مصیبتیں آئی ہیں۔ گھنشیام سنگھ نے بھی اپنی دلہن کے مرنے پر یہی سوچا! ایک لڑکی چھوڑ کر مرنے والی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس کے گھر کو بے چراغ کر گئی۔ لڑکی کا سہارا ہی کیا۔؟ پرایا دھن! پنچھی پکھیرو کی طرح گھڑی دو گھڑی بسیرا کر کے چلی جائیگی وہ اسے "بھگوان کی اِچھا" ہی کہکر من سمجھا لیتے! انہوں نے اپنا دوسرا بیاہ بھی نہیں کیا! کبھی بھول کر بھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ جو کچھ ہُوا ہے میرے اسی جیون کے کئے کا پھل ہے۔

گھنشیام سنگھ نے اپنے باپ دادا کی نیکیوں میں کوئی حصہ نہیں بٹایا تھا لیکن ان کی لڑکی ردا اپنے باپ کی پوری طرح ورثہ دار بنی ہوئی تھی! سارے گھر میں آنکھیں کھولکر اس نے پاپ ہی پاپ دیکھا تھا۔ اپنے پاپی باپ کی سیاہ کاریوں اور بدچلنیوں کی بہت سی کہانیاں ارہر اور ایکھ کے کھیتوں میں چپکے چپکے اس نے اپنی ان سکھی سہیلیوں کی زبانی سنی تھیں جنکے ساتھ ہر صبح و شام وہ "جنگل" جایا کرتی تھی۔

دیہات کی لڑکیاں نیم کے درخت کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں پھر ایسے ماحول میں رہ کر جہاں ہر وقت اور ہر گھڑی سیکڑوں جوانیوں کے بننے بگڑنے کے قصے بیان کئے جاتے ہوں۔ اگر جوانی گنگا جمنا کے سیلاب کی طرح نہ آجائے تو کون تعجب کی بات ہے۔

"رودا" کتنی جلدی نوجوان ہو کر بھرپور جوان ہو گئی۔ گھنشیام سنگھ اسے بالکل محسوس نہ کر سکے! باپ بیٹی دونوں دو غافل اور انجان مسافروں کی طرح چپ چاپ اپنی اپنی راہ چلے جا رہے تھے۔ جن کو ایک دوسرے کے حال کی کوئی خبر نہ تھی۔ گھنشیام سنگھ نے "نوجوان رودا" کے لئے ابھی تک کسی بر کی بھی تلاش نہ کی تھی۔ ان کی نگاہوں میں اٹھارہ بیس سال کی پہاڑ جیسی جوان لڑکی ابھی دودھ پیتی بچّی ہی تھی--! کبھی کبھی جب ان کی چوپال میں گاؤں کی جوان لڑکیوں کے شادی بیاہ کے قصے چھڑ جاتے تو وہ اپنے "ناریل" کے حقّے سے سلفے کے دو چار کش کھینچکر ٹھنڈی سانس بھرتے "ہاں اب دو چار سال میں مجھے بھی اپنی رودا کا کوئی بندوبست کرنا ہی ہوگا"

کتنے برسوں سے وہ یہی کہتے چلے آ رہے تھے شائد دو چار برس سے ان کا مطلب چالیس پچاس سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ نوجوان لڑکی کو گھر بٹھائے رکھنے پر سب سے زیادہ مضبوط استدلال وہ یہ پیش کرتے "کہ کچھ رودا مجھ پر بھار و نہیں ہے" خوشحال مقدم۔ جیون پاسی اور رستم بقال ان کی ہاں میں ہاں ملا کر اکثر تائید اور تائید مزید کے اہم فرائض انجام دیتے جیسے "ہاؤس آف کامنز" میں کسی خاص معاملہ پر لمبی چوڑی تائیدیں کی جا رہی ہوں۔ ٹھاکر کی آنکھیں چوپال کے کونے کونے میں ناچنے لگتیں۔ گویا ہر در و دیوار سے اُن کے اس نیک خیال کی تائید ہو رہی ہے۔

جب کسی کے دانت کے نیچے مُردار دب جاتا ہے تو مشکل سے چھوٹتا ہے۔ بڑھاپے میں تو حرص و ہوس کی آگ اور بھی دہک اٹھتی ہے۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ کی بدکرداریاں بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ نکھر چکی تھیں! ہیتم یاران کا خاندانی "دھردا ہا" تھا۔ اس کا

باپ بھی "دوگاہی" کی دو تین قسطیں لیکر بیاج میں زندگی بھر کی جوتا گیا۔ اب بچپن سے یتیم بھی اپنے باپ کے کئے کی سزا بھگت رہا تھا! بچپن سے کام کاج کرتے کرتے وہ ٹھاکر کے کنبہ میں مل جل گیا تھا۔ ٹھاکر اسے مانتے بھی بہت تھے انہوں نے اسے دو قسطیں "دے کر" پاس ہی ایک گاؤں میں سورج چمار کی لڑکی "مرلیا" سے اسکا گنٹھ بندھن کرا دیا تھا۔ جو اپنی خوبصورتی اور "سندرتا" میں پاس پڑوس میں بہت مشہور تھی۔ اب لوگ کہتے تھے کہ یہ چمار کی نہیں کسی چھتری یا برہمن کی لڑکی ہے۔

رودا اور یتیم قریب قریب ہمسن تھے۔ دونوں ساتھ ہی کھیلے کودے اور ساتھ ہی جوان ہو گئے۔ رودا بچپن ہی سے یتیم کو چاہتی۔ مگر یتیم نے کبھی بھولکر بھی یہ نہیں بھلایا کہ وہ ایک نیچ ذات چمار ہے۔ وہ رودا کو ہمیشہ اپنے مالک کی لڑکی اور اونچی ذات کی کنیا کی طرح مانتا تھا۔ رودا نے کتنی بار اپنے "نسوانی وقار" کو کچلکر اس کے مردانہ جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔ آنکھوں کے اشاروں سے کتنی ہی بار سمجھایا لیکن وہ ایکمرتبہ بھی اسکا مطلب یا تو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔!

غریب کی نگاہوں میں پرائی آبرو کی کتنی لاج ہوتی ہے۔ یتیم کی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ اس نے رودا کی ایک بات کا بھی جواب کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیا۔ نہ جانے کتنی خاموش اور سنسان تنہائیوں میں وہ اپنے مردانہ جذبات سے لڑائی لڑکر نکل آیا.........اور رودا.........اسے پاپی نہ بنا سکی۔!

وہ خوب سمجھتا تھا کہ جس طرح ایک عورت اپنی عزت و آبرو بچانیکی ذمہ دار ہے ویسے ہی مرد بھی! پاپ کی سزا عورت اور مرد دونوں کیلئے برابر ہے۔ وہ استقلال اور پامردی کے ساتھ اپنے مضبوط ارادوں پر اٹل رہا۔ اور رودا اسے برابر پاپ کی دلدل میں دھکیلتی ہوئی

آگ میں جلنے کیلئے اشارے ہی کرتی رہی۔

جب سے "مرلیا" پیتم چمار کے گھر بیاہ کر آئی تھی۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ پیتم پر پہلے سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ بات بات پر ڈانٹنا، گالیاں دینا بالکل بند ہو گیا تھا۔ کہاں تو مہینوں اور برسوں اس کی طرف راستہ بھی نہ نکلتے اور اب دن میں دو دو تین تین مرتبہ خود پیتم کو بلانے جاتے۔ مرلیا اُن کے بلا کھانسے کھنکھارے دروانہ چلے آنے پر لمبا سا گھونگھٹ نکال کر دیوار کی طرف مُنہ پھیر کر بیٹھ جاتی! ٹھاکر کے بہت پوچھنے گچھنے پر بھی وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ اتنے دنوں میں اُس نے کبھی آنکھ بھر کر بھی انکو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

کانگ بونے کا زمانہ قریب تھا۔ ربیع کی فصل بونے کیلئے کھیتوں کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ کچھ رات گئے سے سب لوگ ہل لیکر کھیتوں میں چلے جاتے۔ اور پھر دس گیارہ بجے تک کھیت جوتتے رہتے۔ پیتم چمار بھی آدھی رات سے مُرلیا کو اکیلا چھوڑ کر کھیت چلا جاتا اور اونچی آواز میں "دوہے" کے بول دیہاتی لہجہ میں گا گا کر روتی ہوئی رات گذار دیتا۔ کبھی کبھی ٹھاکر بھی اتنی ہی رات کو ٹہلتے ہوئے پہنچ جاتے اور کھیت کی مینڈ پر کھڑے کھڑے حقّے کے دو چار کش کھینچکر اُلٹے پاؤں واپس آجاتے۔

ایک چاندنی رات میں جبکہ سارا گاؤں سو رہا تھا کبھی کبھی پاس کے کھیتوں سے بیلوں کے ہنکانے کی آوازیں آجاتی ہیں۔ ٹھاکر اپنے گھر سے نکل کر دبے پاؤں پیتم کے جھونپڑے میں چلے گئے۔ پیتم چمار تھوڑی ہی دیر پہلے ہل لیکر کھیتوں کی طرف جا چکا تھا۔ "مرلیا" ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑی ہوئی جاگ رہی تھی۔

"پیتم" قریب پہنچکر انہوں نے دھیرے سے پکارا۔!

"مرلیا" گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اور لمبا سا گھونگھٹ نکالکر چارپائی سے اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ ٹھاکر خود اس کے برابر بیٹھ گئے! وہ سکتہ میں رہ گئی!

"مرلا" کیا چھیتم گیا" انہوں نے پیار کے لہجے میں "مرلیا" کو مرلا بناتے ہوئے پوچھا!

مرلیا نے پلنگ سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمت کر کے جوابدیا۔

"کھیت گئے ہیں......... چاچا"

"اٹھتی کیوں ہے بیٹھ جا" ٹھاکر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھال لیا۔

مرلیا نے بڑی ہمت کی مگر اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے! اس کے قدم اٹھائے نہ اٹھ سکے۔ زبان رک گئی۔ بدن کانپنے لگا۔ ٹھاکر نے ہاتھ بڑھاکر اس کا گھونگھٹ الٹتے ہوئے کہا۔

"یہ گھونگھٹ کیوں نکالے ہو"

اس کا چاند جیسا خوبصورت چہرہ چمکنے لگا۔ جیسے ساون بھادوں کی اجالی راتوں میں بادل کا کوئی ٹکڑا ہٹ جانے سے ماہتاب چمکنے لگتا ہے۔ اس کی نگاہیں نہ اٹھ سکیں۔

ٹھاکر کچھ زیادہ بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ ان کی چوپال کے پاس سے چند کتوں کے ایک ساتھ بھونکنے اور آدمیوں کے بھاگنے کی آہٹ معلوم ہوئی اور وہ جلدی سے اٹھکر باہر نکل آئے لیکن چلتے چلاتے بھی انہوں نے "مرلیا" کا منہ چوم ہی لیا۔

غریب اور مجبور عورت کی آبرو ہی کیا۔! پھر چار دن کی بیاہی دیہاتی لڑکی تو دو حرف بھی زبان سے نہیں نکال سکتی! باقی رات مرلیا نے رو رو کر اسی سوچ میں گذار دی

گھڑی بھر بھی اسکی آنکھ نہ لگ سکی - ذرا سی آہٹ میں ایسا معلوم ہوتا جیسے ٹھاکر کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں - اور زبردستی اس کا منہ چومے لیتے ہیں - وہ سوچتی تھی کہ اگر آج کی بات بیتم سے کہتی ہے تو نہ جانے وہ کیا خیال کرے - ایشور جانے اس کے خیال میری ہی طرف سے بدل جائیں یا غصہ میں وہ کوئی ایسی بات کر بیٹھے جس سے زندگی بھر پچھتانا پڑے پاپی کی زبردستیوں سے آبرو کے لالے پڑے ہوئے ہیں! موذی مر سکتا ہے تو کسی جتن ہی سے اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے -!

صبح ہوتے ہوتے وہ یہی فیصلہ کر سکی کہ آج رات کی ایک بات بھی وہ بیتم سے نہ کہے گی -

---

دوپہر کے قریب بیتم گھر واپس آیا - مرلیا کو دیکھ کر اس کے جیون میں بسنت کی طرح ہریالی آگئی - دو چار ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اس نے روٹی کھائی اور ٹھاکر کے یہاں صبح کیلئے گیہوں لینے کو چلا گیا! کیونکہ سویرے گیہوں بونے تھے۔

انگنائی میں سفید ساری باندھے ہوئے رودا بیٹھی تھی - اس کے سامنے بھنڈی کی ترکاری رکھی ہوئی تھی جسے وہ کاٹ رہی تھی! بیتم کو دیکھکر مسکرانے لگی۔

" صبح گیہوں بونے کیلئے .... تو لدو " اس نے نیچی نگاہیں کئے ہوئے رودا سے کہا۔

" اور جو نہ تولوں " مسکراتی ہوئی وہ بولی -

تو میرا کون ساگھاٹا ــــ نقصان تمہارا ہی ہوگا - وہ بھی ہنس دیا -

رودا ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی - " اچھا لے لو "

سامنے کی سہ دری میں بکھاریاں بنی ہوئی تھیں پاس ہی بانسوں کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ رودا سیڑھی پر چڑھنے لگی ہیتم نے منع کیا لیکن اس نے ایک نہ سُنی! بانس کے ایک ایک ڈنڈے پر چڑھ کر وہ سیڑھی کو ہلا رہی تھی اور ہیتم کی طرف دیکھ کر مسکراتی جاتی!

نہ جانے سیڑھی کی کس کیل میں اسکی ساری اُلجھ گئی اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہی۔!

ہیتم نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔

میں منع کرتا تھا...... چوٹ تو نہیں لگی رودا؟ اس نے پوچھا۔ رودا نے دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں! اور اپنا سر اس کے کاندھوں پر ٹیک کر اسے بھینچ لیا اس کے روئیں روئیں سے چنگاریاں برس رہی تھیں! ہیتم گھبرا اٹھا! وہ ڈر رہا تھا آگ پھونس میں لگ چکی ہے کہیں شعلے نہ بھڑک اٹھیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ لاکھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن رودا کے ہاتھوں میں بلا کی قوت آگئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی!

"یہ کیا کر رہی ہو رودا ---- ٹھاکر تجھے اور مجھے دونوں کو مار ڈالینگے"

"مگر اب میں کب زندہ ہوں" اس نے جواب دیا۔

اچھا آج نہیں...... پھر کبھی! ہیتم نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

"پھر کب" رودا نے پوچھا

کاتک بلوں ---- "ایکادشی" کو!

رودا نے اس کا منہ چوم لیا۔ "کہاں پیارے"

"یہیں چوپال میں کچھ رات گئے!" ہیتم کا کلیجہ دھک دھک ہو رہا تھا!

"نسوانی وقار" کو خاک میں ملاتے ہوئے رودا کئی بار اپنے آپے سے گذر گئی

اور بمشکل متیم پیچھا چھڑا سکا۔

دس پانچ دن کے ہیر پھیر سے ٹھاکر کچھ رات گئے پھر ایک دن متیم کے یہاں پہنچ گئے! تھوڑی ہی دیر پہلے متیم ہل لیکر کھیت جا چکا تھا۔ مرلیا اس کے جانے کے بعد سے جاگ رہی تھی، ٹھاکر کے پاؤں کی آہٹ پہچان کر وہ چپ چاپ پلنگ کے نیچے کھڑی ہو گئی! ٹھاکر نے آتے ہی اس کا لمبا سا گھونگھٹ الٹ دیا اور ہاتھ پکڑ کر کھاٹ پر بٹھال لیا۔!

مجھ سے بھی ڈرتی ہو مرلا؟ انہوں نے کہا۔

"چاچا........" وہ کچھ زیادہ نہ کہہ سکی! اس کا گلا بھینچ گیا۔ زور زور سے سینہ اچھلنے لگا۔

ٹھاکر نے اپنی مضبوط باہوں سے بھینچتے ہوئے کہا!

"تم کتنی سندر ہو مرلا"

مرلیا نے بہت جی کڑا کر کے اپنے چہرہ پر مسکراہٹ بلا ہی لی۔ گویا اب وہ راضی تھی۔

ٹھاکر نے ذرا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کئی مرتبہ اس کے ہاتھ دبا دیئے اور اسے کھینچکر اپنے برابر لٹا لیا!

"ٹھاکر میری لاج اب تمہارے ہاتھ ہے .... اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔!" اس نے ہمت کر کے اتنا کہہ ڈالا!

"نہیں...... نہیں مرلا، تم اطمینان رکھو! ہماری بھی تو عزت ہے۔ تم تو پنچوں کو

ایک آدھ کھانا اور دس بیس روپیہ جرمانہ دے کر پھر برادری میں مل سکتی ہو مگر میں تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اگر کسی نے جان لیا۔ ٹھاکر نے جواب دیا۔

"ہاں یہی کہتے ہیں اور بس ۔۔۔!"

تو پھر آؤ .... نا ......!

بڈھے نے اظہار مطلب کر ہی دیا۔

مگر اتنی جلدی کا ہے کی ٹھاکر ...... پھر کسی دن ۔۔۔ وہ بولی

"اور آج بھی تو موقع ہے" ٹھاکر نے کہا۔

نہیں تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ آج چھوڑ دو۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکنے لگی۔ ٹھاکر اس کا مطلب سمجھ گئے۔

- اچھا یہ بات ہے تو پھر کس دن"؟

"بس پرسوں ایکادشی کے دن"

"ہاں تو میری چوپال میں دس گیارہ بجے رات کو"!

مرلیا نے وعدہ کر لیا۔ ٹھاکر تھوڑی دیر بیٹھے رہے اور پھر اٹھکر چلے گئے۔

کاتک کی ایکادشی "ڈھٹون" کے تہوار کی وجہ سے بہت مشہور دن ہوتا ہے۔ موسمی اور فصلی تہواروں میں اس دن سنگھاڑے اور ایکھ کا نیا کیا جاتا ہے اور کئی دیوتا کی پوجا چڑھائی جاتی ہے۔ آج کی "ایکادشی" بڑی ہنگامہ خیز بن گئی تھی۔ ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے گھر بھر میں ایسا معلوم ہوتا تو جیسے "انتظار" کے دیوتا خود سے گئے ہیں! گھنشیام سنگھ ہیں کہ جبڑے کی کیلیں تک نکلوا دینے پر تلے ہوئے ہیں

کر بدل رہی ہے۔ سرسوں کے تیل سے اس کا سر تر بتر ہو رہا ہے۔ ٹھاکر نے سویرے اٹھتے ہی کہہ دیا کہ آج "گنگا پور" میں کتھا ہے۔ وہ کچھ دن رہے سے چلے جا ئینگے! رودا نی پتیم چمار کے آتے ہی کہا:۔

"آج ایکادشی ہے نا...... پتیم؟"

"ہاں آج تو ایکادشی ہے" پتیم نے ایسے جواب دیا جیسے وہ بھول گیا تھا۔

"کچھ یاد بھی ہے تم کو" رودا بولی!

یاد کیوں نہ ہوتا...... پتیم نے جواب دیا۔

رودا مسکرانے لگی۔ پتیم چلا گیا۔

اِدھر ٹھاکر بھی دن میں کئی مرتبہ پتیم کے گھر ہو آئے تھے!

"مرلا! آج ایکادشی کا تہوار ہے نا...... مرلا۔ نہاؤ گی نہیں"!

اس نے بھی ٹھاکر کو یقین دلا دیا کہ وعدہ اسے یاد ہے!

ٹھاکر نے جیسے تیسے دن کاٹا۔ شام سے کچھ پہلے ہی کپڑے بدلکر نکل گئے۔

شائد میں سویرے آسکوں رودا۔

چراغ جلنے سے کچھ پہلے ہی ٹھاکر اپنی چوپال کی اس کوٹھری میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے آج مرلیا کو بلایا تھا۔ آہستہ سے کواڑ کھولکر اندھیرے میں پڑی ہوئی کھاٹ پر چپکے سے لیٹ رہے تاکہ پلنگ کے چرچرانے کی آواز نہ آئے۔

بار بار ان کی آنکھیں جھپک کر کھل جاتیں۔ ذرا ذرا دیر بعد ایسا معلوم ہوتا جیسے تو پھر در ست مرلیا دبے پاؤں وعدہ وفا کرنے کے لئے چلی آرہی ہے! دروازہ کے قریب پہنچ گئی ہے

انگنائی میں کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہو رہی ہے ان کے کان بج رہے تھے۔ جیسے کسی نے دروازے کے پٹ کھول دیئے!..... لیکن جب اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تو خالی کوٹھری میں اندھیرے کے سوا کوئی نظر نہ آتا۔ انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ سارے گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی دور پر ایک آدھ کتے کے بھونکنے کی آواز ضرور آ جاتی! یکایک کسی کے دھیرے دھیرے آنے کی آہٹ سے وہ چونک پڑے۔!

اندھیری کوٹھری میں ان کی تیز تیز سانسیں اس طرح آواز دے رہی تھیں جیسے سنسان جنگل میں جھینگر بول رہا ہو۔

چوں..... وں سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اندھیرے میں ایک خاموش سایہ...... دھیرے دھیرے...... قدم بڑھاتا ہوا تیز سانسوں کی طرف بڑھتا ہوا چلا گیا...... اور...... اور..... ایک کھلی ہوئی آغوش میں اس کا دبکا ہوا جسم۔!

تھوڑی سی کسمساہٹ کے بعد...... آہستہ سے کسی نے کہا:

"پیارے...... بیٹیم"!

متحرک جسم دریا کے پانی کی طرح ٹھہر گئے۔

"کون...... رودا؟"

پہلی آواز لرز گئی..... "پتا...... جی؟"

جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے ایسے ہی رودا چار پائی سے تڑپ گئی۔

دونوں چپ چاپ سر جھکائے ہوئے کوٹھری سے باہر نکل گئے۔

آسمان پر چھٹکی ہوئی چاندنی ان کے چہروں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

صبح ہوتے ہوتے سارے گاؤں میں پتیم چاچا اور لیا کے بھاگ جانے کا چرچا ہونے لگا۔ اکثر لوگ کہہ رہے تھے کہ بیچارہ بڑا سیدھا تھا۔ لیکن آج تک کوئی یہ نہ جان سکا کہ وہ کیوں بھاگ گئے"

جب جوانی آ رہی تھی!

ان پہاڑی سردیوں میں .... میرے پاس کوئی بھی گرم کپڑے نہیں ہیں پپّا.....
..... ؟ تمام کوٹ جمپر، پانٹس سب پھٹ چکے ہیں .... یہاں تک کہ "رائیڈنگ" کے
لئے ایک برجیس بھی باقی نہیں ؟

پپّا کے سامنے میں نے محبت بھری التجا پیش کر دی!

پپّا مسکرا دیئے " بے بی! تم کتنی اچھی اور بھولی لڑکی ہو!! جس نے اپنے باپ کی گاڑھی کمائی بچانے کیلئے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیا۔ اگر خدا نہ کرے بیمار ہو جائیں تو ...... ! ہاسٹل کی دلچسپ سوسائٹیوں میں کھو کر ایک خط بھی نہ لکھا کہ تمہارے پاس کپڑے بھی نہیں رہے !!

"پھر میں کیا کرتی پپّا" — ! خط لکھتیں بے بی .... میں روپیہ بھیج دیتا .... ؟

پپّا نے قہقہہ لگاتے ہوئے "پرس" نکالی ؟ تازے تازے نوٹوں کی گڈی نکالتے ہوئے بولے! " لو آج ہی کپڑے بنا لو —"

ہنستے ہوئے میں نے نوٹوں کو جھپٹ لیا — ؟

تم کتنے اچھے ہو میرے "پپّا"

ان کی آنکھوں میں مجھے خوش دیکھ کر مسرت کے آنسو چھلک آئے ، اور

"شب بخیر" کہتے ہوئے وہ ہاسٹل کے ملاقاتی کمرے سے باہر نکل گئے۔

"مامی" کو مرے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ میری عمر دس برس سے کچھ زیادہ ہی تھی جب مجھے ڈیرہ دون بھیج دیا گیا؟ یہاں ہاسٹل اور کالج کی زندگی نے مجھے اپنا لیا تھا ——! سورج نکلنے سے پہلے اٹھنا، نہانا دھونا۔ لطیفہ، مس جیمس، روزی اور کملا کے دل فریب جھرمٹ میں "واکنگ" کرنا۔ ناشتہ اور پھر لکھنا پڑھنا، پھر کالج، سہ پہر کو کھیل کود کبھی کبھی شام کو پکچر! یہی میری زندگی کا یادگار پروگرام تھا۔ چھٹے چھ ماہ بعد پپّا آتے اور مجھے اپنی مسرور آنکھوں سے خوش و خرّم دیکھ کر واپس جاتے! کیونکہ ان کو چھٹی نہیں ملتی تھی۔ وہ اسی صوبہ میں جیل سپرنٹنڈنٹ تھے! میرا دنیا میں ان کے اور "سہیل" کے سوا کوئی بھی نہ تھا! سہیل میرے ماموں کا لڑکا تھا۔ انگلستان میں کئی برس سے بیرسٹری کی ڈگری کیلئے باپ دادا کی جمع کی ہوئی گاڑھی کمائی بیدردی سے اڑا رہا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ مرتے وقت "مامی" پپّا سے کہہ گئی تھیں کہ میری اکلوتی بیٹی کا ناتہ سہیل سے جوڑ دینا۔

میں نے ان کو بہت دن ہوئے دیکھا تھا جب میں بہت چھوٹی تھی اور وہ اچھے خاصے جوان؟ انہوں نے مجھے محبّت سے گلے لگا کر چوم لیا تھا اور بس۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

ہوسٹل کی زندگی میرے لئے روز بروز دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میری سہیلیوں میں لطیفہ بڑی متین اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ "قدرتی مناظر کے مشاہدے" یا تصویر کشی میں گذرتا۔ وہ اکثر بہت کم بات چیت کرتی تھی! اس کے برعکس روزی اور کملا بڑی شریر اور بلّی لڑکیاں تھیں۔ یہ دونوں مجھ سے سن میں بڑی تھیں لیکن آپس میں بالکل برابر۔ "مس جیمس" کتنی اچھی تھیں، اب بھی

جب یاد کرتی ہوں تو ان کی بوڑھی جوانی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے! اس کی فطرت میں بزرگی، محبت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کمبخت روزی اکثر کہتی، "دیدی" اگر تو کسی گرجا کی پوپ بنادی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ شریر کملانے تو "بوڑھی ملانی" اس کا نام ہی رکھ دیا تھا۔ اور منکسر وہ ان سب کی دلچسپیوں میں دل بڑھا دیتی! سارے ہوسٹل بھر میں مجھے نفرت تھی تو اس کمبخت بوڑھی "لیڈی ڈاکٹر" سے! جس نے مس کراؤن جیسی شریف لڑکی کو ایک ذرا سے پیٹ میں درد ہونے پر نہ جانے کیا رپورٹ کر کے ہاسٹل سے نکلوا دیا تھا۔ یہ نفرت پیٹی اینگلو انڈین بڑھیا دسویں پندرھویں نہیں تو مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور سب لڑکیوں کا "میڈیکل ٹیسٹ" لیتی۔ "بلیک روم" میں لیجا کر ایک ایک لڑکی کی جسمانی ساخت اور خدا جانے کن کن چیزوں کو دیکھتی۔ میں اور میری ہمسن لڑکیاں چونکہ بہت چھوٹی تھیں۔ اس لئے ان کے ساتھ "بلیک روم" والا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ مگر پھر بھی ہم لوگوں کو اس طرح ٹٹولا جاتا تھا جیسے "نمبرنگ" کیلئے ویٹرنری ڈاکٹر اُن جانوروں کو ٹٹولتا ہے جو ذبح کئے جانے کیلئے چُنے جاتے ہیں۔

"میڈیکل ٹیسٹ" کیلئے جب ہم سب جمع تھے تو "بلیک روم" سے میرا نمبر پکارا گیا! میں سمجھی کہ دھوکے میں غلط نمبر پکار لیا گیا ہے!

دوبارہ پھر نمبر "۳۳" میں اب بھی نہ گئی۔

پھر آواز آئی، "مس شہناز رحمان" اب تو یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میرا ہی نمبر! میرا ہی نام۔ یا اللہ کیا معاملہ ہے۔

اندر چلی گئی ——!

وہی اینگلو انڈین لیڈی ڈاکٹر —— بیٹھی تھی جس سے مجھے اللہ واسطے کا

ہیر تھا ———!

موٹے موٹے..... شیشوں کی عینک سے جھانک کر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی بولی:۔

"دیکھو ——— مس رحمان...... اب تم جوان ہو رہی ہو!..... اور...... تم کو چاہیئے کہ...... اپنی خوبصورتی اور جوانی کی حفاظت کرو! اس نے رُکتے ہوئے کہا۔

"تم کو چاہیئے، اپنے خیالات، اور رجحانات صرف اپنی تعلیم اور صحت کی طرف بدل دو ——— خوبصورتی اور جوانی صرف نیک چلنی اور خوش سیرتی سے مِل سکتی ہے ——— ؟ تم کو چاہیئے......؟"

میری آنکھیں بالکل زمین میں گڑی ہوئی تھیں اور میں ——— اچانک محسوس کر رہی تھی ——— کہ جوانی آ رہی ہے!..... لیکن...... لیکن...... کیا مجھ میں اِس بوڑھی نفرت کرنیوالی لیڈی ڈاکٹر نے کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو اس کو نیک چلنی کی ہدایت کرنا پڑی مجھے! نہیں...... نہیں...... ضرور اس سے میرے خلاف جھوٹی باتیں کہی گئی ہیں...... ورنہ وہ یہ لکچر کاہیکو دیتی؟

زندگی میں پہلی مرتبہ سچ مچ میرے دل کو ٹھیس لگی! میرا دل بھر آیا..... نفرت اور غصّہ سے بدن کا رُواں رُواں کانپ اٹھا۔ میرا سر...... چکرانے لگا...... آہ...... اگر آج میری "مامی" مجھکو اس دنیا میں بالکل تنہا چھوڑ کر نہ چلی جاتیں تو یہ سب کچھ کاہے کو سُننا پڑتا۔ آہ...... میرا دل اس منحوس ہاسٹل کی پُر فریب...... اور بہت دلچسپ دنیا سے نفرت کرنے لگا۔ میں کانپ رہی تھی۔

بڑھیا نے کہا! لیٹ جاؤ میز پر!

میں اس کی ہیبت سے سہمی ہوئی چپ چاپ سامنے والی میز پر لیٹ گئی۔
کرسی سے اٹھکر بوڑھی میم میز کے کنارے ...... میرے مُنہ کے پاس آگئی۔
انہیں موٹے موٹے شیشوں کی عینک سے جھانک کر اس نے کہا۔ ؟ " آنکھیں کھولی رہو ---!"

میں نے ڈر کر آنکھیں کھولدیں پھر خود بخود نہ جانے کیوں آنکھیں جُھک گیئں!،
پپوٹوں کو زبردستی کھولتے ہوئے بولی وہ ---- !

پتلیاں پھراؤ۔

میری پتلیاں نیچے جُھک گیئں ..... ان میں کوئی گردش نہ ہو سکی"
اس نے جھلّا کر آنکھیں چھوڑدیں۔ دل کی طرف بڑھی۔ جمپر کو ہٹاتے ہوئے " اسٹھتسکوپ " لگادیا۔

" زور سے سانس لو ..... نیچی سانس ...... اور زور سے ..... پھر نیچی سانس !"

میں کوئی بھی سانس نہ لے سکی۔ دل ضرور دھڑکنے لگا!
ساری کا پلّو ہٹا کر ..... اس نے جمپر کے " فاؤسنٹ " کھولدئیے۔
سینے پر کوئی پردہ نہ تھا۔

میں نے بے اختیاری میں کروٹ لے لی " سیدھی لیٹو! سیدھی! مجھی اس نے زبردستی سیدھا کرتے ہوئے کہا:۔

سینے کو کئی جگہ سے دباتی ہوئی بولی! دونوں ہاتھ اونچے کردیا! بغلوں کی ملائم جلد کو اپنے کھُردرے ہاتھوں سے ٹٹولا مجھے گدگدی سی لگنے لگی ..... ہاتھ پھر نیچے ہو گئے۔

پیٹ، پسلیاں ...... رانیں اور جسم کے مختلف حساس اعضاء کے ساتھ "طبِ جدید" کا یہی مظاہرہ کیا گیا۔ میں بری طرح پھڑک گئی۔ سارا جسم پسینے پسینے ہو گیا۔

"جاؤ" نمبر ۳۴

میں بلیک روم سے باہر نکل آئی ــــ!

آج کالج میں چھٹی تھی۔ سب لڑکیاں "شاپنگ" کیلئے بازار جا رہی تھیں۔ مس جیمس اور روزی نے مجھے بھی لیجانا چاہا۔ میں بھی جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ بہت سا کپڑا خریدنا تھا لیکن نہ گئی۔ ...... سر میں کچھ میٹھا میٹھا سا درد ہو رہا تھا ...... اور رہ رہ کر میرے دل میں یہ خیالات امنڈ رہے تھے کہ "میں اب جوان ہو رہی ہوں" جوانی آ رہی ہے جوانی"۔ اندر سے اپنا کمرہ بند کر کے چپ چاپ مسہری پر لیٹ رہی۔ کئی بار کتابوں سے دل بہلانا چاہا مگر کچھ نہ پڑھ سکی! ...... کسی بات میں آج دل ہی نہ لگتا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ بار بار یہی سوچتی تھی کہ ...... جوانی آ رہی ہے! جوانی"

"جوانی کیا ہوتی ہے"؟ مجھکو کچھ بھی معلوم نہ تھا صرف اتنا یاد ہے کہ میری بوڑھی انا میری شرارتوں پر ڈانٹ کر اکثر کہا کرتی تھی کہ "بے بی شرارت نہ کرو ورنہ جوانی آجائیگی"۔ اس وقت میں سمجھتی تھی کہ جوانی کوئی مہیب قسم کی ڈراؤنی چیز ہو گی جو شریر و شوخ بچوں کو ان کی شرارت پر سزا دیتی ہو گی .... پہلے مجھے جوانی سے اتنا ہی ڈر لگتا تھا جتنا میں لنگوری بندر ...... اور کالی بلّی سے ڈرتی تھی۔ یہ کمبخت لنگوری میرے ہاتھ سے ایک دن پیسٹری چھین کر لیگیا تھا ...... یہ موٹی کالی بلّی ...... ، تو میرے سامنے چائے کی میز پر رکھے ہوئے دودھ دان کا سارا دودھ چٹ کر گئی تھی ..... مگر

......مگر...... آج نہ جانے کیوں مجھے جوانی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ خدا معلوم میرے دل میں آج جوانی کے کیا معنی تھے میں خود بیان نہیں کر سکتی ——! میں خیالات کے ہجوم سے گھبرا گئی سینے کی طرف دیکھا...... دھڑک رہا تھا...... ابھی تک میں وہی ساری پہنے ہوئے تھی جس کو اس بوڑھی لیڈی ڈاکٹر نے چھو لیا تھا...... اٹھ کھڑی ہوئی...... ...... اس ساری کو نہ پہنوں گی اب! الماری سے دوسرا جمپر اور دوسری ساری نکالی۔ ......سنگار میز کے پاس جا کر جمپر اتارا وہی جمپر جو اس موئی بڑھیا نے چھوا تھا...... ...... جیسے اس جمپر سے بھی نفرت ہونے لگی...... مجھے یاد آگیا...... اس نے میرے سینے کو بھی چھوا تھا...... دل میں آیا...... غصہ میں کئی مرتبہ اس بوڑھی لیڈی ڈاکٹر سے کہیں زیادہ بدسلوکی کی۔...... اپنے سینہ کے ساتھ...... جو سرخ ہو گیا تھا ہاتھوں کو اٹھایا...... مگر نگاہیں نہ اٹھ سکیں...... بغلوں کی طرف!!

جلدی جلدی ساری بدل کر میں مسہری پر لیٹ کر پڑ رہی...... پھر منہ کھولدیا ...... کتنی الجھن تھی آج —— ؟ "کیا سچ مچ جوانی آرہی ہے" کروٹیں بدلتے بدلتے آنکھیں بند ہوگئیں...... میں نے دیکھا...... جوانی آرہی تھی...... ایک بہت بڑی دریا کے کنارہ میں لطیفہ، روزی، حسن جمیس اور کملا ٹہل رہے ہیں۔ یکایک بڑی خوفناک آوازیں آنے لگیں! روزی اور کملا وغیرہ بھاگیں...... سیلاب ہے...... سیلاب ...... بھاگو...... میں سکتے میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ دیکھوں سیلاب کیسے آتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی دوڑتی ہوئی لہریں پاؤں کے نیچے آگئیں...... گھبرا کر چونک پڑی۔ کتنا ڈراؤنا خواب تھا بھیانک! دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، کچھ ہلکا ہلکا سا ٹمپریچر...... اور سر میں درد بھی تھا —— مسہری سے اٹھ کر میں نے اسپرو

کی گولیاں حلق سے اتار لیں۔۔۔۔۔۔کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔۔۔لطیفہ تھی؟

"کیسی ہو شہنا" اس نے پوچھا —!

کچھ ٹمپریچر اور ہلکا سا درد ہے سر میں —! میں نے استقبال کرتے ہوئے جواب دیا۔"

"اوہ۔۔۔۔تب تو تم فوراً لیڈی ڈاکٹر۔۔۔۔۔کو دکھلاؤ۔۔۔۔۔۔آج کل موسم اچھا نہیں ہے۔ میں لیڈی ڈاکٹر کو کہتی ہوں ابھی —!

"نہیں۔۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔لطیفہ بہن۔۔۔۔۔میں بالکل اچھی ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے!"

"یہ تمہاری کون سی ضد ہے۔ بیماریوں میں ایسی ضد اچھی نہیں ہوتی" لطیفہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر میں تو بالکل اچھی ہوں۔۔۔۔۔اب! اسپرو کی گولیاں کھالی ہیں۔۔۔۔۔۔آؤ چل کر تھوڑی سی چائے پی لیں بس"

اتنے میں قہقہوں کا طوفان اٹھاتی ہوئی روزی، کملا اور مسز جیمس آگئیں۔ بات کہیں سے کہیں پہونچ گئی تھی۔ سب چائے پینے کیلئے چل دیں۔

چائے پر مسز پیریروزی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے پوچھا:

"کہو شہنا" میڈیکل ٹیسٹ کیسا رہا تمہارا —؟

کملا نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔

"ویسا ہی جیسا تمہارا سب کارہ ہوگا ہے"

لطیفہ نے پیسٹری کے ٹکڑے کو جھنجھوڑتے ہوئے راز کھول دیا۔

"لیکن ہم کو تو بخار نہیں آیا تھا "

میں جھینپ گئی ۔ سب لڑکیاں چمٹ گئیں ۔ کیوں ! کیا ہوا شہنا ؟ کیسی ہو کس وقت بخار آیا ...... کون سی دوا دی تم کو لیڈی ڈاکٹر نے .... افوہ ..... تمھارا ماتھا اب تک جل رہا ہے ۔ ہزارہا اور مسلسل سوالات نے میرے حواس کھو دیئے ۔

سب لڑکیوں نے نہ جانے اشاروں ہی اشاروں میں کیا بات چیت کر لی ۔ روزی نے لیڈری کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا ـــ ! تو پھر اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم سب کا ایک ڈنر .... تم پر واجب ہو گیا شہنا !؟

میں نے پوچھا ...... کیوں .... !

وہ کہنے لگی ..... " میڈیکل ٹیسٹ " میں جو لڑکیاں ہر طرح پوری اترتی ہیں ان سے ڈنر لیا ہی جاتا ہے ۔ "اچھا تو ہو گا ڈنر"

روزی کی ہاں میں ہاں ملانے والی لڑکیوں نے ہلڑ مچا دیا ۔ پاس پڑوس سے اور بھی لڑکیاں آگئیں ـــ اور بالاتفاق رائے " ڈنر " کا دن مقرر کر دیا گیا ..... اگلا اتوار ۔

کالجوں اور سکولوں میں سوسائٹی کا ڈسپلن ہی بڑی چیز سمجھا جاتا ہے ! اور باری باری ہر ایک کو بیوقوف بننے کیلئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے ...... چنانچہ میں بھی بیوقوف بنائی گئی ، اور بننا پڑا ـــ !

کھیل کود کا وقت آچکا تھا .... سب لڑکیاں سبز سبز لان پر پہنچ گئیں تھیں ۔ روزی اور کملا نے بہتیرا چاہا کہ مجھے بھی کھینچ لے جائیں ۔ لیکن میں نے عذر کر دیا کہ میرا جی نہیں لگتا ...... اور اپنے کمرہ میں چلی آئی ۔

کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر کے سنگھار میز کے سامنے کرسی پر جا کر بیٹھ گئی ـــ

بڑی دیر تک آئینہ میں اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن آنکھیں چار نہ ہو سکیں...... آج میری نگاہوں میں کچھ عجیب قسم کی شرم اور نئے انداز کی حیا پیدا ہو گئی تھی۔ کئی بار کنگھا اٹھا کر میں نے الجھی ہوئی لٹوں کو درست کرنا چاہا...... مگر...... کچھ بھی نہ کر سکی!

آج میں نے اپنے جسم کو کئی مرتبہ دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن شرم...... نجانے کہاں کی شرم مجھ پر ٹوٹ پڑی تھی۔

غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر گئی...... سوکھے ہوئے ٹب پر ترس آ گیا۔ میں دن میں کتنی بار نہاتی تھی اور کتنی مرتبہ منہ دھوتی تھی۔ جی میں آیا۔ لاؤ نہا ڈالوں۔ شاید اسی طرح کچھ ہلکا ہو جائے جی! ٹب میں پانی بھرنے کے لئے نل کو میں نے کھول دیا نہانے کے کپڑے میں نے پہن لئے!

ٹب تھوڑی دیر میں لبریز ہو گیا جیسے ہی میں نے اس میں قدم رکھا ہے خواب والا سیلاب یاد آ گیا۔ بدن میں خوف وہراس کی جھرجھری پیدا ہو گئی۔ جیسے دریا کا پانی میرے پاؤں کے نیچے آ گیا۔

صابن کی جھاگ سے پورا ٹب ہمالیہ کی چوٹی کی طرح سفید نظر آ رہا تھا اور اس برفانی چوٹی سے صرف میرا نکلا ہوا سر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اپنے جسم کے ان حصوں کو دیکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ جو اس منحوس لیڈی ڈاکٹر نے چھو لئے تھے۔

نہانے سے میرا تمام جسم پاک ہو گیا تھا۔ اور میں اتنا خوش تھی جیسے گنگا سے نہا کر ایک، جاتری، خوش اور مسرور ہوتا ہے۔

کہاں سے کہاں!

بھرپور بدن کا نازک مرمریں اور سیمیں مجسمہ! مخمور گلابی آنکھوں میں حجاب آگیں جوانی کی توبہ شکن انگڑائیاں! کتنی خوبصورت اور شکیل ہوگی لڑکی! مس شمسہ جمیل بلا کی ذہین، قیامت کی طباع، شوخ و طرار، لکھتی ہے تو الفاظ کی گنگا جمنا بہاتی چلی جاتی سوچتی ہے تو فردوس اور ناہید کی تخیلی دنیا سے کوسوں دور نکل جاتی ہے۔ محاورات اور روز مرہ جیسے لال قلعے کی ٹکسالی زبان! کتنی خیالی جنتیں اس کے ننھے سے دماغ میں رقصاں و جنباں ہیں۔

"محبت" کتنا عجیب و غریب نظریہ پیش کرتی ہے محبت کے متعلق یہ لڑکی!

— کیا سچ مچ محبت فریب نفس کا ایک خوبصورت اور رنگین نام ہے "مرد، عورت کی جمالیاتی کائنات پر ڈاکہ ڈالنے کیلئے، اس کے حسن و شباب پر قبضہ کرنے کیلئے، محبت کا فریب دیتا ہے عشق کا ڈھکوسلا بناتا ہے! کیا واقعی اس جمیل ادیبہ نے اپنے تازہ ترین شاہکار "ناہیدہ" میں اپنے دل کی چھپی ہوئی گہرائیوں کو نقش بر آب نہیں کر دیا۔

"ناہیدہ" اپنی کائنات دوشیزگی کو ...... مرد کی ابلہ فریبیوں اور رنگینیوں کی نذر کر دینے سے پہلے اپنے ڈوبتے ہوئے سفینے کو طوفانی موجوں میں غرق دیکھتے ہوئے مسکرانا چاہتی تھی! وہ سچ مچ ناہید تھی۔ عصمت، عفت، دوشیزگی اور وقار نسوانیت

جیسے چمکتے ہوئے تاروں کے جھرمٹ میں اپنی زندگی کو وہ ایک مکمل اور کامیاب زندگی دیکھنا چاہتی تھی ، اس کے نزدیک عورت اس "سماجی مرد" کی آغوش میں بھی جسے شوہر کہتے ہیں اگر جذبات اور ہوس کا شکار ہوجاتی ہے تو وہ مکمل عورت نہیں رہتی۔

شمسہ کے متعلق کتنی تخیلی تصویریں میرے ذہن کے گوشے گوشے میں جگمگانے لگیں ۔ یہ کمسن ادیبہ بڑی ہوکر کتنی لافانی شہرت اور عزت حاصل کرے گی ۔ ادب اور افسانے کی دنیا میں کتنے جاودانی نقوش کبھی نہ مٹنے والے پاکیزہ نظریئے پیش کرے گی۔

مگر آہ ...... دوشیزگی کی نوجوان حسرتوں میں ! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے چھپے ہوئے دل میں انسانیت اور سماج کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں بھڑک رہی ہیں۔ وہ مرنا چاہتی ہے ! ایسے ارادہ کے ساتھ جو عورت کا ارادہ ، دوشیزگی کا عزم ، اور عصمت کی ہٹ ہے ۔ کنواری لڑکی خدا کیلئے دنیا کی حسرتوں کو پامال نہ کر ، سوچ اور سوچ ، تیری تحریریں ، تیرے خطرناک ارادوں کی کتنی آئینہ دار ہیں ، میں دیر تک سوچتا رہا۔

رسالہ "خیال" کے ہر ماہانہ شمار سے انھیں "شمسہ" کے انقلاب انگیز افسانے پڑھتے پڑھتے اس ننھی ادیبہ کے متعلق ہزار ہا رنگین تصورات میرے دل ودماغ پر چھا چکے تھے ۔ کتنی خیالی تصویریں ، کتنے تصوراتی سراپے ! میں نے بنا ڈالے تھے ۔ اس لڑکی کے متعلق ! جس سے اردو ادب اور افسانہ نگاری بہت سے گراں مایہ نظریئے حاصل کرنے کیلئے بیتاب تھا ۔ جس کی تحریریں موجودہ دور میں ایک ایسا لافانی شاہکار خلق کررہی تھیں جو ابدالآباد تک زندہ رہنا چاہتا تھا ۔ اے کاش جو کچھ وہ لکھتی ہے ، وہ اس کے سچے جذبات دلی احساسات اور ذاتی نظریئے نہ ہوں ! خدا کرے ...... یہ سب کچھ افسانہ ہو اور خود

اس کی زندگی اس افسانوی تمثیل سے کوسوں دور، محض ایک دوشیزہ کی پریشان، پراضطراب اور بیقرار زندگی ہو! اس کا دل معصوم دل تڑپ رہا ہو، اس کبھی نہ مٹنے والی خلش کیلئے جو ایک الھڑ اور معصوم لڑکی کے دل کو بے چین کر دیتی ہے۔

اے ننھی ادیبہ! تجھے کیا معلوم کہ تیرے اِن ادبی شاہکاروں پر جان دینے والے، کتنے شاعر اور ملک کے کتنے اہلِ کمال ہیں جو تیری ذرا سی جنبشِ چشم و ابرو پر اپنا سب کچھ نثار و قربان کر دینے کیلئے تیار ہیں، میرے دل میں بھی اشتیاق اور تمناؤں کا سمندر موجیں مارنے لگا، دل کی بے اختیارانہ کشش کہنے لگی کہ تیری لافانی محبت کو شمسہ ضرور لبیک کہدیگی، لیکن ایک نادیدہ عاشق ایک دوشیزہ کو اس طرح محبت کا پیغام کیسے دے سکتا ہے۔ عورت، عورت کے دل کا راز جان سکتی ہے! میں نے ایک فرضی سہیلی کا روپ بھر کر اسے لکھا۔

میری پیاری شمسہ! تسلیمات!

آپ کے افسانے ماہنامہ "خیال" میں پڑھتی رہتی ہوں! کیا "محبت" کے متعلق آپ نے جتنے نظریئے ان افسانوں میں پیش کئے ہیں وہ آپ کے ذاتی خیالات ہیں! میری اس بیباکانہ جسارت کو معاف فرمایئے گا میں اس سلسلہ میں یا تو آپ کی ہم خیال بن جاؤں گی یا آپ کو اپنا ہم خیال بنالوں گی۔

کیا آپ اپنی ایک ہمراز سہیلی سمجھ کر مجھ سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کرنا پسند کرینگی۔

آپ کی بہن

"رفعت" احسان علی آز بنارس

ہفتہ بھر کے بعد ہی مجھے شمسہ کا ایک لفافہ ملا۔

میری پیاری بہن رفعت!

آداب، آپ کا خط ملا، میرے افسانوں میں آپ نے جو کچھ پڑھا ہے وہ میرے سچے خیالات اور ذاتی تاثرات ہیں محض افسانوں کی رنگ آمیزی کے لئے اپنے صحیح نصب العین اور ذاتی خیالات سے ہٹ جانا میں پرلے درجہ کی "ادب فریبی" اور ادب کیساتھ انتہائی بے ادبی سمجھتی ہوں! مرد ایسے سماجی اور فطری فریب کو میں ہمیشہ فریب سمجھتی رہی اور سمجھتی ہوں۔ میں نے خود شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اگر آپ اِس سماجی دھوکہ میں نہ آچکی ہوں تو خدا کیلئے فوراً انکار کر دیجئے! سوسائٹی و سماج کا ہمت کیساتھ اسی وقت مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم آپ جرأت و پامردی کے ساتھ اس کے ڈھکوسلوں کو توڑ دیں۔ یہی نہیں بلکہ مرد کو دنیا کے دائرہ انسانیت سے اس طرح خارج کر دیں۔ جس طرح اس بزمِ موجودات میں کبھی اسکا وجود ہی نہ تھا۔

یہ سچ ہے ایسی صورت میں دنیا کی تخلیق ضرور ختم ہو جائیگی۔ لیکن بہر حال یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہے۔ دنیا آج نہیں تو کل ختم ہی ہو کر رہے گی۔ فطرت مرد سے عورت کی مظلومیت کا انتقام لے گی اور لے کر رہے گی۔ پر ہم اس سلسلہ میں اس کا ہاتھ کیوں نہ بٹائیں۔ میں وقارِ نسوانیت کو قائم رکھنے کیلئے عصمت اور عفت کو سماج کی آندھیوں سے بچانے کیلئے نہ محض خود بلکہ ساری دنیا کو تباہ و برباد دیکھنے کیلئے بیقرار ہوں۔ کاش آپ بھی میری ہم خیال بن سکیں......؟

آپ کی

"شمسہ"

خط پڑھتے ہی میری بیقراریوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اب کسی خبر کی گنجائش باقی نہ تھی۔ افسوس، ننھی ادیبہ! معصوم لڑکی نے جو کچھ لکھا تھا حقیقتاً وہ اس کے ذاتی تاثرات اور ادبی نتائج تھے۔ تعجب تو اس بات کا تھا کہ کمسن لڑکی ـــ جو ابھی ایک معصوم اور بن کھلی کلی تھی اس نوجوانی اور کمسنی پر شادی سے انکار ہی نہیں تنفر کا اظہار کر رہی تھی۔

شمسہ کے انکار نے میرے دل کی بیقراریوں میں اور بھی آگ لگا دی۔ میں بن دیکھی اس کا نادیدہ عاشق تو ہو ہی چکا تھا، اشتیاق اور اضطرار نے بے چینیوں میں ایک ایسا اضافہ کر دیا کہ شمسہ کی خیالی تصویر درد سراپا بن گئی۔ دل اس کو اپنا لینے کیلئے اس طرح تڑپنے لگا جیسے دریا کے کنارے ریت میں تڑپتی ہوئی مچھلی پانی میں سما جانے کیلئے بیقرار ہو۔!

آپ جانتے ہیں جب محبت کا بھکاری کسی کے در سے ٹھکرا دیا جاتا ہے، جب محبت کی تکمیل میں انکار کی چٹان سنگِ راہ ہو جاتی ہے تو انسان کتنا پاگل، کتنا دیوانہ اور خبطی ہو جاتا ہے! محبت انتظار اور وعدوں پر کتنا زندہ رہ سکتی ہے، ہزار ہا برس لکھو کھا سال، اگر صرف محبت کی تسکین جھوٹے وعدوں سے کر دی جائے تو ہجر و فراق کی لذتیں صدیوں کیلئے انسانوں کو زندگی بخش سکتی ہیں، انسان امیدوں پر مر جانے کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن شمسہ، ناسمجھ شمسہ نے میرے چوٹ کھائے ہوئے دل پر انکار کا ترکش خالی کر کے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن کر دیا، میری تمناؤں کو خاک میں ملا دیا۔

اے کاش! وہ سمجھ سکتی کہ پھول اسی لئے ہوتے ہیں کہ بھونرا اس سے رس لے، شمعیں جلتی ہیں اور اسی لئے کہ پروانوں کی پیاس بجھا سکیں، چاند چکور کیلئے جگمگاتا ہے اور

انسان محبت کیلئے پیدا ہوا ہے، میں نے اس کے خط کا جواب لکھ کر بھیجدیا۔

پیاری شمسہ! تسلیم!

محبت نامہ پہنچا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تم نے میرے خط کے جواب میں اپنے کسی نئے افسانے کا کوئی حصہ نقل کر دیا ہے۔ میری پیاری بہن! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ تم نے افسانوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ افسانہ ہی ہوگا اور میں تم کو بہت جلد اپنی "بھابی" بنانے میں کامیاب ہو جاؤنگی ـــ

لیکن اب شائد تم کو رام کرنے میں کچھ دیر لگے گی، سماج اور سوسائیٹی کے بندھن توڑ ڈالو، رسومِ جہالت کا خاتمہ کر دو۔ مگر خدا کیلئے نظامِ قدرت اور فطرت کی آہنی دیواروں سے نہ ٹکراؤ۔

میری اور تمھاری جیسی کروڑوں عورتیں خود کو فنا کر کے قدرت کے اصولوں کو نہیں توڑ سکتیں۔ سماج ہماری کمزوریوں کا نام ہے، اور مرد صرف "ایک ماں کا بچہ" دنیا کی کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ مرد تنہا نظامِ عالم کو سلجھا لینے پر قادر رہا ہو۔! مرد اور عورت جسمِ انسانیت کی دو روشن آنکھیں ہیں اور ایک آنکھ کے بغیر یہ مجسمہ بیکار ہے!

شادی تو ابھی میری بھی نہیں ہوئی ہے لیکن اس وقت تک سچ مچ میں شادی نہیں کروں گی جب تک تمھیں اپنی "بھابی" بنا کر اپنے گھر نہ لے آؤنگی ـــ!

تمھاری

"رفعت"

میں سمجھتا تھا کہ ضدی لڑکی جھنجلا کر میرا خط پھینکدے گی اور ہرگز کوئی جواب نہ

دے گی۔ میں اپنا بھائی بن کر خود اپنی شادی طے کرنے کیلئے اس کافر کو رام کرنے پر تُلا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح اس باغی ادیبہ کے سر سے بغاوت کا جنون کر دوں، محبت کے بے پناہ انتظار میں پندرہ بیس روز کے بعد دفعتاً شمسہ کا خط آہی گیا۔ لکھا تھا۔

بہن رفعت!

آداب عرض کرتی ہوں خط پہنچا شکریہ! اس طرف میں کچھ بیمار ہو گئی تھی اس لئے جواب نہ دے سکی امید ہے کہ معاف کر دو گی۔ تعجب ہے کہ تم نے میری "تحریک بغاوت" کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تمہارے دل و دماغ پر تہذیب قدیم کی روایاتِ جمیل کا تسلط ہے، میں کہتی ہوں محبت تو محبت! اس خود غرض انسان کو انسانیت سے بھی دور کا علاقہ نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ اگر ہمارے بزرگ کوئی غلطی کر چکے ہوں تو ہم بھی اس غلطی کو ضرور دُہرائیں۔

عورت و مرد کے جنسی تعلقات دراصل فطرت کی مجبور تعلیم نہیں ہیں! مسیحی کلیساؤں میں رہنے والی سیکڑوں عورتیں آج رہبانیت اور تجرّد کی زندگی بسر کر رہی ہیں اور اُن کی روحانیت، صحبت، اور انسانیت نہ محض مائل بہ ترقی ہے بلکہ یہ قابلِ رشک زندگیاں کامیابی کے قدم چوم چکی ہیں۔

پیاری بہن! پھول اتنی ہی دیر خوبصورت اور مشکبار رہتا ہے جب تک شاخِ گل کی زینت رہ کر تتلیوں اور بھونروں کے نرم و سخت پنجوں کی گرفت سے محفوظ و مامون رہے، عورت بھی ایک خوبصورت پھول ہے جس کی جوانی، خوبصورتی، اور عصمت سے کھیلا نہیں جا سکتا۔ خدا کرے نہ تم کسی کی بھابی بن سکو اور نہ میں۔"

تمہاری "شمسہ"

شوخ و طرار ادیبہ کے اس بیباکانہ جواب نے رہی سہی آس بھی توڑ دی! یہ تو ممکن تھا اور تھا بھی ایسا ہی کہ میں کسی کی "بھابی" نہ بنوں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ شمسہ "رفعت" کی بھابی بن کر میرے دل کی دنیا کو آباد نہ کرے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ ساعت بھی کتنی دلچسپ گھڑی ہو گی جب میں شمسہ کے معصوم دل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جیت لوں گا۔ اس کے باغیانہ فلسفہ کو وہم باطل ثابت کر کے اس کی دلکش جوانی، نظر فریب اداؤں اور خشک فلسفہ میں اُلجھی ہوئی عطر بیز گھنیری زلفوں کے پرچم اپنے شانوں پر لہراتے ہوئے دیکھوں گا اور وہ محسوس کرے گی کہ زندگی، فلسفے، نظریہ اور دوسروں کے تاثرات کا نام نہیں ہے! حقیقی زندگی پُر کیف ارمانوں اور غم فراموش تمناؤں میں مل سکتی ہے۔۔۔ یہاں تک کہ شمسہ مجبور ہو جائے گی اور .... اور ...... کھلکھلا کر ہنس دے گی کہ میں نے اپنے افسانوں میں جو کچھ لکھا تھا وہ محض افسانوی فلسفہ تھا کیا تم کو ان کی صداقت پر سچ مچ یقین آگیا تھا ...... کبھی ...... کبھی!

اسی انکار و اضطرار کے جہنم میں کروٹیں بدلتے ہوئے میں نے شمسہ کے خط کا جواب لکھ دیا۔

مری پیاری بھابی "شمسہ"!

خدا کیلئے مجھے معاف کر دینا تمہارے فلسفہ کا جواب آج میں گستاخیوں سے دے رہی ہوں! اس لئے نہیں کہ لاجواب ہو کر تمہارے سامنے مجبور ہو گئی بلکہ اس لئے کہ تم میں سچ مچ میری بھابی بننے کی صلاحیت موجود ہے! میرے بھائی جان بھی تمہارے ہی جیسے سرپھرے ادیب ہیں! سماج سوسائٹی رسم و رواج ان سب کے قاتل دشمن ہیں

فرق ہے تو صرف اتنا کہ تم سماج سے خفا ہو کر فطرت سے بھی لڑنا چاہتی ہو، قدرت کے فولادی نظام کو پاش پاش کر دینے پر تلی ہو اور وہ صرف سماج کے آہنی حلقوں کو مسمار و منہدم کرنا چاہتے ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ پھول صرف چمن کی زینت ہی بن کر پھول رہ سکتا ہے میں کہتی ہوں یہ "جنگلی نقوش" اگر ہماری محفلوں میں آکر گلدانوں میں نہ سجائے جاتے تو آج ہم اور آپ اس تحقیقات میں سر کھپاتے نظر آتے کہ آیا یہ پھول نباتات سے تعلق رکھتے ہیں کہ جمادات سے! زمین کے کسی پُرخار پودے کی کائنات ہے یا کسی صحرائی پرند کا خوبصورت انڈا ———!

میری ہونیوالی بھابی! عورت ایک زنگ آلود تلوار رہ جاتی اگر زربفت کی نیام میں مرد اسے اپنی کمر کی زینت نہ بنا لیتا، یہ ماہتابی راتیں یقیناً ایک بیکار چیز ثابت ہوتیں، اگر شبہائے فرقت کی تاریکیاں وجود میں نہ لائی جاتیں۔ بہن معاف کرنا تمہارا وجود محض "قربانیوں" سے دنیا کی رونق نہیں بڑھا سکتا۔ بلکہ تمہیں اس کیلئے مرد کا مرہونِ منت ہونا پڑیگا ـــ سمجھیں! کیا تم اب بھی میری چہیتی بھابی بننے کیلئے تیار نہیں ہو۔

تمہاری "رفعت"

لکھنے کو تو میں نے اتنا سب کچھ لکھدیا، مگر یقین تھا کہ ہٹیلی لڑکی سرپھری دوشیزہ شمشیر بے نیام کی طرح برہم ہو جائے گی عجب نہیں کہ "باغی ادیبہ" توہین کا دعویٰ دائر کردے یا یہ تمام خطوط اپنے اباجان کے سامنے رکھدے اور ...... وہ لوگ اپنی پہلی فرصت میں یہاں آن پہونچیں! پتہ لگ گئیں ...... اور پھر نہ جانے کیا ہو؟؟

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی دوسری سہیلیوں میں ان خطوط کا پرچار کر کے میرا مضحکہ اڑائے! اور اس کی سہیلیاں بھی تو ویسی ہی سرپھری انقلابی چھوکریاں ہونگی

جیسی وہ خود ہے .... ہاں ہاں ایک آدھ میری ہمخیال ضرور ہو گی کوئی، اور وہ مجبور کرے گی ہنسائے گی، سمجھائے گی! شائد ممکن ہے اس کی نوجوان تمناؤں میں کوئی ایسی لہر آجائے جس سے میرے دل کے نغموں کا ساز اس کے دل کی گہرائیوں میں وجد کرنے لگے اور وہ اپنی آرزوں بھری جوانی کی خودکشی سے باز آجائے۔

سچی محبت دراصل کافر سی کافر حسینہ کے دل کے گہرائیوں میں بھی اپنا گھر کر لیتی ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ آگ لگے اور دھوا ں نہ ہو" ہجر و فراق کی آتشِ فروزاں مجھے خاکِ سیاہ کر رہی ہو اور میرے گھر کو تباہ کر دینے والے چین کی نیند سو رہے ہوں!

اے ننھّی ادیبہ! باغی لڑکی! اگر یہ پہاڑ جیسی راتیں میں نے رو رو کر گذاری ہیں تو بھی کیا ...... تیرے دل میں بھی یقیناً ایک ایسی درد آفریں خلش پیدا ہو گی ہے جو تجھے بھی چین نہ لینے دیگی، جتنے خیالی خاکے میں نے تیری ان دیکھی صورت کے بنائے ہیں اتنے ہی تصورات تیری آنکھوں میں بھی مچل رہے ہوں گے میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرے افسانوں کے فلسفوں میں کتنی نرماہٹ، نظریوں میں کتنی ملائمیت، تحریروں میں کتنا سوز و گداز، اندازِ بیان میں کتنی دھڑکن، اُلجھن خلش، اور اضطرار پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے. فطرت سے بغاوت کا طوفانی جذبہ کتنا سرد ہوتا معلوم ہو رہا ہے اب، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تو جو کچھ لکھ رہی ہے وہ صرف افسانہ ہی ہے. میں کتنا خوش نصیب اور قسمت والا ہوں کہ میرے جذبۂ دل کا تیر خطا نہ کر سکا ہمالیہ کے پتھر کی چٹان کو میرے جذبۂ دل نے موم کی طرح ملائم بنا دیا۔

اے حسینہ! اگر تو نے میرے کئی خطوط کا جواب نہیں دیا تو کیا — میں تجھ کو

لکھتا رہوں گا۔ اور برابر لکھتا رہوں گا یہاں تک تجھے خطوط لکھوں گا کہ ایک دن مجبور ہو کر تو اپنے غلط نظریوں سے توبہ کر لے گی۔ اپنے باغی فلسفہ کو نقشِ باطل سمجھ لیگی۔ اور اپنی ہمراز سہیلی رفعت کی بھابی بن کر میرے دل کی اُجڑی ہوئی بستی بسالے گی جہاں صرف میں ہوں گا —— اور تو! مچلتی ہوئی تمناؤں کے بیقرار آبشار ہوں گے! اور محبت کی مئے ارغوانی کے چھلکتے ہوئے جام! کبھی میں تجھے پلاؤں گا اور کبھی تو مجھے! تو بات بات پر روٹھے گی میں تجھے منانے کیلئے تیرے حریم ناز کی جبہہ سائی کروں گا اور تجھے مناؤں گا۔

اے لڑکی تیری نسائیت میری محبت کا کھلم کھلا اقرار نہیں کر سکتی میں خوب سمجھتا ہوں عورت کی محبت کا راز اگر افشا ہو جائے تو محبت کی حلاوت میں فرق آجاتا ہے!

تو نہ لکھ! ہرگز نہ لکھ! مجھے اب تیرے خطوط کا انتظار نہیں —— بلکہ خود تیرا انتظار ہے؟

جن دنوں میری پُرسکون زندگی پر شمسہ کی جُدائی کے فراق آگیں بادل منڈلا رہے تھے اور میری ساری راتیں آنکھوں میں کٹ رہی تھیں شمسہ کے رومان پرور افسانے ادب اور افسانہ نگاری کی دنیا میں جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے، میں اس کو رفعت کی " بھابی " بنا لینے کیلئے خط پر خط اور وہ بھی بلا انتظار جواب لکھ رہا تھا کہ میرے ایک بچپن کے ساتھی اور کلاس فیلو قیوم صاحب کا ایک خط بہت دنوں کے بعد آپہنچا لفافہ میں ایک تصویر تھی ایک اچھے خاصے مسٹنڈے اور ہٹے کٹے ملاجی کا زندہ جان " اسکیچ " اودھ فارسٹ جیسی گھنی داڑھی، ہرا بھرا چہرہ، ڈوبی ہوئی آنکھیں، ستواں ناک، بڑے بڑے کان، چوڑا چکلا سینہ! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی کانفرنس کا

خطبہ صدارت پڑھتے پڑھتے ادھورا چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔ خط میں لکھا تھا۔

میرے پیارے .... سلام مسنون

آج بہت دنوں کے بعد تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں میرے ایک ادیب دوست رضوان کمالی بڑے پُرلطف آدمی ہیں، ایک عرصہ سے "مس شمسنہ جمیل" کے فرضی نام سے افسانے لکھ رہے ہیں جو بہت مقبول ہو رہے ہیں کچھ دنوں سے ایک محترمہ رفعت احسان علے .... بنارس سٹی! رضوان کو اپنے بھائی کی شریک زندگی بنانا چاہتی ہیں ذرا پتہ لگاؤ! یہ محترمہ کون صاحبہ ہیں اگر واقعی وہ خود میرے دوست رضوان کی شریکِ حیات بننا پسند کریں تو بسم اللہ! یہ حاضر ہیں! رضوان کی تصویر بھیج رہا ہوں دیکھ لو! منت مانی ہے کہ شادی ہو جانے پر داڑھی منڈوا دیں گے، کیا تم میرے ساتھ مل کر یہ ثواب دارین حاصل کرنے میں میرا ہاتھ نہ بٹاؤ گے۔! امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گے۔

تمہارا اپنا .... قیوم

نیچے کی سانس نیچے! اوپر کی اوپر! حیرت و استعجاب سے اُس "ننھی" ادیبہ کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ داڑھی، دوشیزگی، عصمت، عفت، محبت، ہجر و فراق کتنے متضاد زاویۂ نگاہ جھپکتے ہی بن اور بگڑ رہے تھے اور میں سر کھجا کر سوچ رہا تھا کہ الٰہی اب میں کیا کروں ....!"

ایک مکان کی خاطر

خواجہ آتش علیہ الرحمتہ کا ایک شعر ہے کہ

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ مرحوم نے یہ شعر پہلی جنگِ عظیم سے پہلے کہا تھا! یعنی کہ جب آتش جواں تھا ـــــ ورنہ فی زمانہ "خودکشی" کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کو موت مانگنے پر بھی نہ آتی ہو تو وہ فوراً کانپور، لکھنؤ، لاہور اور کلکتہ وغیرہ ایسے بڑے شہروں کی طرف ہجرت کر جائے ـــــ اگر خدانخواستہ ریلوں میں انسانوں کی ریل پیل سے بچ بچا کر کہیں بخیریت ان شہروں میں پہنچ گیا تو بس سمجھ لیجئے کہ نہ محض "جیون کا سارا دُکھ" دُور ہو جائیگا بلکہ یہ نوبت پہونچ جائیگی بقول غالب

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہُوا یہی کہ لکھنؤ پہونچکر مکان کا مسئلہ ایسا اُلجھ کر رہ گیا کہ اللہ تیری پناہ! ایسے ایسے دوستوں عزیزوں اور رفیقوں نے آنکھیں پھیر لیں ـــــ جن سے یہ قطعی وعدہ ہو چکا تھا۔ کہ اگر ہم تم سے پہلے مر جائیں تو ہماری قبر پر ایک عالیشان مقبرہ بنا دینا ـــــ اور اس پر

ایک کتبہ بھی لگا دیتا ـــــ مگر جب مکان کے متعلق اُن سے عرض کیا تو نگاہیں نیچی کر کے کہنے لگے یہی لوگ ـــــ!

" بھئی ـــــ مکان ـــــ مکان کا سوال تو بڑا ہی ٹیڑھا ہے آجکل ـــــ

ـــــ ہاں غریب خانہ حاضر ہے ـــــ!"

" جی مکان کیلئے آپ کہہ رہے ہیں اس منحوس شہر میں ـــــ جس کا نام ہے لکھنؤ ـــــ اجی توبہ کیجئے! مکان کی نیت ہی بدل دیجئے!"

" میں کہتا ہوں قبرستانوں میں کرایہ کی قبریں بھی اس لڑائی کے زمانہ میں ملنا دشوار ہیں ـــــ آپ کہتے ہیں مکان کیلئے ـــــ!"

اچھا صاحب! کچھ اور باتیں کیجئے۔ اس مکان کے قصّے کو جانے ہی دیجئے اب وہ

" اگر ایسی ہی تکلیف ہے ـــــ تو ـــــ تو دس پانچ روز کیلئے ـــــ میرے اسٹور روم میں آجائیے ـــــ اور کیا عرض کروں!"

" میں خود بیحد پریشان ہوں ـــــ میرے ایک عزیز مع بیوی بچّوں کے دو مہینے سے ہوٹل میں پڑے ہیں ـــــ خاص عزیز ـــــ بالکل خاص"

" کرایہ کا کوئی سوال ہی نہ تھا ـــــ اگر میرے قریب میں کوئی مکان خالی ہوتا ـــــ آپ فوراً آسکتے تھے!"

ادھر میری یہ حالت ہو رہی تھی کہ سوتے جاگتے ہر وقت یہی خیال رہتا کہ اگر کرایہ کا کوئی مکان مل جاتا تو اپنی جگہ پر بیٹھ کر کچھ کام کر سکتا ـــــ!

اس طرح دوسروں کے مکانوں میں پڑے پڑے زندگی کاٹنا اجیرن ہوتی چلی جا رہی ہے! کوئی ملنے والا عزیز دوست ایسا نہ تھا جس سے میں دیوانہ وار یہی درخواست

نہ کرنا کہ ——!

" بھائی اگر تمہاری طرف کوئی مکان خالی ہو تو دلوا دو —— کرایہ جو کچھ ہو گا دیدوں گا "!

" ایک کمرہ —— غسلخانہ —— اور پائیخانہ بس اتنا ہی کافی ہے "!

" سخت تکلیف ہے بغیر مکان کے! اجی تم سے یہ بھی نہیں ہوتا —— اتنا کہ ایک مکان ہی تلاش کر دو! "

اجی —— ملا جی! آج جمعہ کی نماز کے بعد! آپ ہی اعلان کر دیجئے کہ مکان تلاش کر دینے والیکو پانچ روپیہ نقد انعام دیا جائیگا۔ اکثر تو یہ نوبت آجاتی کہ جب کسی نئے صاحب سے شرفِ تعارف حاصل ہوتا تو میں یہ کہنے کے بعد "کہ —— آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" —— بہت ہی —— "ہاں اگر آپ کی طرف کوئی مکان خالی ہو تو بتائیے —— مکان کی سخت تکلیف ہے مجھکو "!

ظاہر ہے کہ اس قسم کی بدحواسانہ باتوں کا جواب ہر سمجھدار آدمی یہی دیسکتا ہے! کہ! مکان خالی تو نہیں ہے —— ہاں اگر خالی ہؤا —— تو اطلاع دوں گا —!

مکان کی تلاش و جستجو میں، میں اسقدر دیوانہ ہو رہا تھا کہ یار لوگوں نے بلا سوچے ہوئے کہ —— !

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

میری گھبراہٹوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نہایت ہی خطرناک قسم کا ایک پروگرام بنا ڈالا ——

ہوا یہ کہ بشیر صاحب میرے تقاضوں سے بہت تنگ آ چکے تھے ——— اور جب ان سے ملاقات ہوتی بطورِ یاددہانی مکان کے متعلق ضرور یاد دلا دیتا —— ایک دن آئے کچھ گھبرائے سے کہنے لگے!

مل گیا مکان ——— لاؤ مٹھائی کھلاؤ! فوراً ——— ابھی اسی وقت!

اس شاندار کامیابی پر قریب قریب میں اچھل ہی پڑا تھا ——— اور فرطِ انبساط سے بشیر سے چمٹ ہی جانا چاہتا تھا! دونوں آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے تھے! پوچھا میں نے:-

کہاں ——— کہاں! جلدی بتاؤ جلدی!

اجی میں کہتا ہوں ——— دیر ——— دیر کیوں کر رہے ہو! کپڑے پہن کر فوراً جاؤ! بشیر کہنے لگا! مجھے تو چھٹی نہیں ہے۔ آفس جا رہا ہوں! تم فوراً چلے جاؤ! خاں صاحب سے کہنا وہ فوراً ہی دکھا دیں گے گھر ——!

خاں صاحب سے کیا کہوں گا -؟ میں نے پوچھا!

بس یہی کہنا ——— کہنا کہ جس مکان کے بارہ میں بشیر آپ سے کہہ گئے ہیں۔ دکھا دیجئے ـ باقی سب کچھ میں خود طے کر دوں گا ـ!

خوشی کے مارے میرا بُرا حال تھا ـ یہاں تک کہ میں نے گھبراہٹ میں محض قمیص کے اوپر بنیان ——— اور پھر شیروانی پہن لی! بشیر کو دفتر جانے کی جلدی تھی ——— اور وہ جانے کیلئے بیقرار تھا، یکایک مجھے خیال آ گیا!

ہاں! ——— یہ تو بتایا نہیں ——— کہ مکان ہے کہاں ——— اور خاں صاحب کا نام ———!

بشیر کہنے لگا:۔

لاحول ولاقوۃ! میں کہتا ہوں تم بھی! بس کیا کہوں! اجی خاں صاحب کو نہیں جانتے!
وہی جو خیالی گنج کی موڑ پر رہتے ہیں۔!

"بہت عالیشان مکان ہے اُن کا۔"

"کیا نام بتایا" میں نے پوچھا بشیر سے!

"کہہ تو رہا ہوں! کسی سے پوچھ لینا ——— عبدالصمد خان صاحب شاہجہاں
پور کے رئیس اعظم ہیں ——— نا"

بشیر یہ سب کچھ بتا کر جلدی سے دفتر روانہ ہو گیا ——— اور میں خیالی گنج کیطرف!
راستے بھر سوچتا رہا! کم از کم چھ کمرے اور ایک ڈرائنگ روم تو ضرور ہو گا ——— ایک کمرے
میں سامان وامان ——— ایک کھانے کا کمرہ ہوا۔ ایک کمرے میں لکھنے پڑھنے کا سامان
——— باقی بچا ایک کمرہ اس میں سونے کا انتظام کر لیا جاوے گا ——— اور ڈرائنگ روم۔!
ہاں وہ تو علیحدہ چیز ہے! اب رہا باورچی خانہ۔ تو دراصل میں اس گرانی کے زمانہ میں ذرا
اس کے خلاف ہوں کہ نون، تیل اور لکڑی کا دھندا پھیلایا جائے!

بس ہوٹل اچھے! نہ مہمانوں کا جھگڑا ——— نہ راشننگ کا کھٹکا! ——— لیکن ——— لیکن
ذرا ان ہندوستانی مکانات کے پائیخانے اور غسلخانے کچھ ایسے ہی ویسے ہوتے ہیں ———
خیر دیکھا جائیگا۔ جب رہوں گا رفتہ رفتہ سب ٹھیک کرا لوں گا! بعد میں ——— تھوڑا
تھوڑا کرایہ سے وضع ہوتا رہیگا! ——— یہ بجلی کے بلب اتنے مہنگے ہو گئے ہیں کہ توبہ!
——— اگر ٹھیک ٹھاک بلب نہ لگے ہوئے تو وہ بھی بدلوانا پڑیں گے ——— غالباً سفیدی
وغیرہ تو انہوں نے کرا ہی رکھی ہو گی ——— شاہجہان پور کے رئیس اعظم ——— پھر
پٹھان قسم کے! جن کے بارے میں سنا ہے کہ اگر ناک کر مکھی پر بیٹھ جائے تو ———!

اب سوال یہ ہے کہ جلدی سے جلدی کب تک خالی کردیں گے وہ مکان کو —— بشیر کہتا تھا کہ اسی ہفتہ ان کے بچے چلے جائیں گے آپ اطمینان سے منتقل ہوجائیے گا —— اپنا گھر اپنا ہی گھر ہوتا ہے دراصل! دوست احباب کے یہاں پڑا رہنا حقیقتاً بڑی بیحیائی ہے —— اور سبکی بھی بہت! نہ کسی ملنے والے کو بُلا سکتے ہیں۔ —— نہ اطمینان سے سو سکتے ہیں —— نہ کچھ! پرائی جگہ —— پرایا ماحول! بچے شرارت کر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ دو تھپڑ بھی نہیں مار سکتے ان کو —— ریڈیو بج رہا ہے۔ غزلیں سنتے سنتے جی گھبرا گیا ہے —— مگر زبان سے اُف نہیں کر سکتے!

فی الحال —— فی الحال —— سب فرنیچر کرایہ پر منگالوں گا —— اس میں کون سا عیب! بڑے بڑے لوگ کرایہ کے فرنیچر پر ساری زندگی بسر کر لیتے ہیں —— بس دو چار مہینہ میں دھیرے دھیرے سارا سامان منگوالوں گا! بشیر بھی کتنا اچھا آدمی ہے! مخلص دوستوں کی بھی اس زمانے میں کوئی کمی نہیں ——!

"خیالی پلاؤ" پکاتے ہوئے ہم خیالی گنج پہونچے ہی تھے کہ بشیر کی بتائی ہوئی عمارت مسکرانے لگی! اچھا خاصہ یک منزلہ نہیں دو منزلہ مکان تھا —— تھا تو مشرقی طرز کا بنا ہُوا مگر دراصل بہت ٹھکانے کا خوبصورت بنا ہُوا تھا لب سڑک! سامنے برآمدے میں ایک دراز قامت ادھیڑ عمر —— مرد مسلمان فتحپوری مونڈھے پر بیٹھے ہوئے حقّے سے شوق فرما رہے تھے۔ گھنی گھنی مونچھوں کے چاروں طرف خوبصورت داڑھی —— بھوئیں تنی ہوئیں۔ بڑی بڑی آنکھیں!

سلام علیک کہکر میں نے پوچھا۔ مجھے عبدالصمد خاں صاحب سے نیاز حاصل کرنا ہے!

جی —— مجھ سے! فرمائیے —— فرمائیے! وہ بولے!

بشیر صاحب نے " میں نے برابر پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا " بھیجا ہے مجھے!

بشیر صاحب — کون! وہ کہنے لگے! اچھا — جی ہاں — یہی مکان ہے وہ!

سچویشن تو " میں نے ادب سے عرض کیا " بہت ہی اچھی ہے نہایت کھلی ہوئی جگہ! لب سڑک!

مجھے " خاں صاحب بولے " ایسے مکانوں سے سخت نفرت ہے جو گلیوں میں ہوتے ہیں — ! میں نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا۔ چاہے مکان چھوٹا ہی کیوں نہ ہو مگر اچھی جگہ پر ہونا چاہیئے۔

کتنے کمرے میں اس مکان میں۔ " میں نے پوچھا "

چھ کمرے نیچے۔ " خانصاحب انگلیوں پر جوڑ جوڑ کر بتانے لگے " — اور دو اوپر — ایک ڈرائینگ روم — اور ایک نوکروں کا کمرہ —!

بہت کافی — بلکہ میں نے کہا! ضرورت سے بھی زیادہ! سچ پوچھیئے تو اس سے کم میں ایک سلیقہ مند آدمی کا کام بھی نہیں چل سکتا —!

جی ہاں! خاں صاحب نے حقے کا کش کھینچتے ہوئے جواب دیا! پچاس ہزار لگا دیئے! اِس اتنے سے گھروندے میں — اور اب تو لڑائی کی وجہ سے سامان ہی نہیں ملتا — ورنہ ابھی تو یہ نامکمل ہے — آپ سمجھیں!

خیر وہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہو جائیگا " میں نے کہا " آج کل تو بہت مشکل ہے مکان بنوانا!

اب آپ ہی دیکھ لیجئے، خاں صاحب بدستور حقہ پیتے ہوئے بولے "

جو مز دور چار آنے میں ملتا تھا! آپ سمجھیں! ایک روپیہ میں بھی اب نہیں ملتا ــــ اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر آدمی مِل بھی جائے ــــ تو بھی کیا ــــ جب جلانے کے لئے لکڑی نہیں ملتی ـ مکان بنانے کیلئے کہاں سے مِل جائیگی ــــ اس کا نقشہ! ایک بنگالی انجنیئر میرے دوست تھے انہوں نے بنایا تھا ــــ آپ سمجھیں!! ان بنگالیوں کو انجنیئری میں بڑا ہی ملکہ ہوتا ہے!

اگر زحمت نہ ہو ــــ میں بولا ، تو ذرا تکلیف کر کے دکھا دیجئے گا ــــ واقعی نہائیت ہی لاجواب نقشہ ہے اس مکان کا! بس آنکھوں میں اس کی تصویر کھچی جاتی ہے ـ!

جی ہاں ــــ چلیئے! خاں صاحب نے ملازم کو آواز دے کر کہا ــــ ذرا اندر پردہ کرا دینا!

وہ بدستور حقّے سے شوق فرما رہے تھے بلا شرکتِ غیرے! نوکر نے آکر کہا کہ پردہ ہو گیا ــــ آگے آگے خاں صاحب اور پیچھے پیچھے میں! دونوں اندر پہنچے! خانصاحب نے قلعۂ دلّی کے گائڈ کی طرح کہنا شروع کیا!

”اس کمرے کا طول ۳۰ فٹ اور عرض ۲۰ فٹ کے قریب ہے! دیکھئے نا ــــ! میں نے کتنی مناسب جگہ پر روشندان لگوائے ہیں ـ

جی ہاں! بہت ہی مناسب! میں نے خاں صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جواب دیا! کیا کہنا صاحب ــــ مجھے بھی عمارتوں کا بڑا شوق ہے بلکہ یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے جو نیا مکان بنوایا ہے اس کا پورا نقشہ خود میرا بنایا ہوا ہے!

آپ سمجھیں ”خاں صاحب کہنے لگے ” یہ چیز آپ کسی دوسری عمارت میں نہ پائینگے ـ جو یہاں نظر آرہی ہے آپ کو ــــ یہ جالی جو دروازوں کے

اوپر بنی ہوئی ہے خاص میری بنائی ہے!

سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا کہنا" میں نے کہا" کس قدر نفاست کیساتھ تراشی ہے۔ یہ جالی آپ نے! ماشاءاللہ ــــ ایک ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جالی کے اندر سے ہم لوگوں تک آ ہی گیا۔

جی۔ یہ ڈرائینگ روم ــــ ترکی وضع کا ہے؛ اور آتشدان ــــ آپ سمجھیں بالکل پرشین آرٹ ہے!

آتشدان تو خاص ایران کی چیز ہے نا! ــــ خاں صاحب کہتے چلے جا رہے تھے۔

ان غسل خانوں میں میں نے ایک اور جدت کی ہے ــــ ایک قطرہ پانی ان کے اندر نہیں ٹھہر سکتا ــــ دراصل مجھے نہانے کا بڑا ہی شوق ہے، آپ سمجھیں ــــ اگر میں روزانہ نہ نہاؤں تو بس ۔............؟

جی ہاں ــــ جی ہاں ــــ کافی ہے میں نے جواب دیا ــــ! خود میری بھی یہی عادت ہے بچپن سے! ہفتے میں تو دو تین بار نہانا ضروری کیا بلکہ اشد ضروری ہے ورنہ یوں روز ہی ــــ دراصل نہانے سے انسان کی صحت بہت اچھی رہتی ہے۔

ہندوستانی پائخانوں سے میں سخت عاجز ہوں! خاں صاحب نے پائخانہ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ آپ سمجھیں ــــ پائخانے جس قدر صاف انگریزوں کے یہاں ہوتے ہیں ــــ بس اسی طرز کا یہ بنا ہوا ہے! ــــ لیکن پاٹ سے مجھے اللہ واسطے کا بیر ہے!"

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے خاں صاحب" مجھے تو پاٹ پر بیٹھنا ہی ناگوار ہے!

میں سنے ہاں میں ہاں ملادی!

صحن کی کشادگی پر تھوڑی دیر مباحثہ ہوتا رہا —— اور میں نے کسی جگہ پر یہ ثابت نہیں ہونے دیا کہ میں علم العمارات کا ماہر نہیں ہوں۔ اندیشہ یہ تھا کہ اگر خاں صاحب نے کہیں یہ سمجھ لیا کہ اس شخص میں مکان ٹھکانے سے رکھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو قطعاً وہ اپنا مکان مجھے کرایہ پر نہ دیں گے —— !

میں اور خاں صاحب اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے باہری برآمدے میں آچکے تھے! میں نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔!

آپ کے بچے اسی ہفتہ وطن جا رہے ہیں —— ! خاں صاحب نے اطمینان سے حقّہ کی نے ہونٹوں میں دباتے ہوئے جواب دیا —— !

"جی ہاں —— یہ لوگ تو غالباً پرسوں ڈیرہ سے چلے جائیں گے —— !

اور میں شائد اتوار تک جاؤں —— ! آپ سمجھیں آج کل سفر کرنا بلا اور کرایہ"۔ میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوگا —— !

انٹر کلاس کا —— خاں صاحب نے حقّہ کا کش کھینچتے ہوئے کہا —— کوئی تین روپیہ" —— میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں ——

جی ہاں! —— آپ سمجھیں —— مگر صاحب! خاں صاحب بولے! آجکل کا انٹر تھرڈ سے بھی بدتر ہوتا ہے —— !

بس کچھ نہ پوچھیئے! میں نے جھینپ کر جواب دیا —— آج کل سفر کرنا ڈوب مرنے سے زیادہ مشکل ہے کم از کم! —— لیکن کچھ آپ نے بتایا نہیں —— کرائے کی بابت!

کیسا کرایہ —— خاں صاحب چونک پڑے!

جی ـــــ اسی مکان کا ـــــ کیا ـ کر ـ کر ـ آیہ ہوگا ـ! میں نے ادب کیساتھ عرض کیا۔

"آپ سمجھیں ـــــ" خاں صاحب نے حقّہ کی نے گھڑی کردی ۔ "کیا بک رہے ہیں آپ ـــــ کاہے کا کرایہ پوچھتے ہیں ـــــ!"

"اسی مکان کا" ـــــ میں نے نہایت لجاجت سے کہا ـ!

"اس مکان کا ـــــ آپ سمجھیں ـــــ آپ کا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے کچھ ـــــ یہ مکان آپ کے باپ کا ہے جس کا کرایہ پوچھ رہے ہیں ـ

"خاں صاحب ایکدم سے بپھر پڑے" آپ چلے جایئے فوراً یہاں سے ـــــ ورنہ حواس درست کردوں گا ـــــ آپ سمجھیں ـــــ!

آپ جانتے نہیں میں نہیں ہوں عبدالصمد خاں ـــــ!

خاں صاحب کی اس برہمی پر میں بوکھلا سا گیا ـــــ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خاں صاحب کیا کہہ رہے ہیں ـــــ اور مجھے کیا کہنا چاہیئے ـ پھر خاں صاحب کے غصہ کا یہ حال تھا کہ منہ سے کف جاری ـــــ اور اگر میں کہیں بول دوں بیچ میں ـــــ تو آپ سمجھیں کہ وہ اچھی خاصی مرمت ہی کرڈالیں میری ـ گھبرا کر بلا کہے سُنے ـــــ بھاگا ـ!

سیدھا بشیر کے دفتر پہونچا تو معلوم ہوا کہ صاحبزادے ایک ہفتہ کی چھٹی پر اپنے مکان سب گئے ہوئے ہیں ۔ کئی دن تک طبیعت بہت پریشان رہی ـ تیسرے دن وحیدی سے جب ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ بشیر نے خاں صاحب سے یہ کہا تھا کہ میں اسی طرز کا ایک مکان بنوانا چاہتا ہوں ـــــ برائےکرم آپ میرے دوست کو دکھا دیجیگا ـ وہ اسی طرز کا نقشہ بنا دیں گے ـــــ! وحیدی کہنے لگے ـ شاید بشیر یہ مکان تمہارے لئے بنوانا چاہتے ہیں ـــــ

"ٹکاہیاں"

ایک دھیلے کے مٹر ـــــ دھیلے کے کچالو!

ڈبل کی پھلکیاں ـــــ دہی کی!

ایک پیسے کے دہی بڑے دینا ـــــ مجھے بھی!

میں کتنی دیر سے کھڑی ہوں چندرو چاچا، مجھے بھی ـــــ ڈبل کے کچالو خوب کھٹے کر دینا۔!

"چندرو چاچا" نے گھنی مونچھوں سے پھنکار مارتے ہوئے نظر اُٹھا کر دیکھا ـــــ تو جے شری کھڑی تھی! مٹر، کچالو، دہی کے بڑے! کھٹ مٹھی پھلکیاں ـــــ اور بناسپتی گھی میں تلے ہوئے "سیو" جیسے اس کے مُنہ میں آئے جا رہے تھے! کھٹاس کے ذائقے سے اس کے مُنہ میں پانی کے فوارّے چھوٹ رہے تھے! پھیکا پھیکا منہ بمبے کے نیچے رکھے ہوئے گلاس کی طرح بار بار تھوک سے بھر جاتا۔ ـــــ اور وہ بےچین ہوئی جا رہی تھی۔

چندرو چاچا کو وہ چندرو چاچا بہت دنوں سے کہتی تھی جب سے لچھمن اسے شیو پور

سے بھگا کر لایا تھا! لچھمن سے اس کو کچھ پریم تو تھا نہیں ــــــ مگر ہوا یہ ایک دن کہ جب وہ صبح صبح گھاٹ پر کپڑوں کی لادی لئے جا رہی تھی! بہت میلے کچیلے کپڑے! نند و دادا کی دھوتی! سسر جو ماما کا انگوچھا! ــــــ اور کشن کا جانگیا! جو وہ لام سے بھاگتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا ــــــ جس پر ایک دفعہ جب اس نے دیکھا تھا تو نہ جانے کیسے دھبے پڑے ہوئے تھے ــــــ رام جانے کیسے! اب تو وہ پکڑ لیا گیا ــــــ اس کا جانگیا! اب کرن بابو کے ہاتھ لگ گیا جو شہر میں پڑھتے ہیں ــــــ گرمیوں کی چھٹیوں میں پار سال کی طرح جب اس سال آئے تھے تو ایک دن گھاٹ پر خود گئے تھے مجھ سے کہنے لگے ــــــ کہنے لگے ــــــ کہ جے شری تو بڑی سُندر ہے! میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اپنی ایک دھوتی دے گئے۔ کہ کھرے گھاٹ دھو کر جلدی سے دیدو۔ اس دھوتی میں ایک پانچ روپیہ کا نوٹ بندھا تھا ــــــ! وہ چلے گئے میں جب دوپہر کو دھوتی لیکر گئی تو یہ نوٹ بھی لیتی گئی ــــــ پر اُنھوں نے لیا نہیں!

لچھمن آگے آگے جا رہا تھا ــــــ اور میں پیچھے پیچھے! کچھ فاصلے سے چل رہی تھی! لچھمن کا گٹھر بہت بھاری تھا مجھے دیکھ کر کہنے لگا ــــــ!

جے شری ــــــ ذرا سہارا دینا ــــــ تھک گیا ہوں ــــــ!

میں نے اپنی گٹھری اتار کر زمین پر رکھدی اور اس کو سہارا دینے لگی ــــــ اچانک لچھمن کا گٹھر دور جا کر گرا اور میرے اُٹھے ہوئے ہاتھ اپنی جگہ پر رہ گئے ــــــ لچھمن نے بھنچتے ہوئے کہا! تو بڑی جالم ہے" سریا"! میں ایسا گھبرا گئی کہ کچھ کہہ نہ سکی۔

دوسرے دن سارے گاؤں میں ہلّہ ہو گیا کہ لچھمن نے جے شری ...... پیچھے کی کمیٹی باندھ کر پنچایت کا کھانا لگا دیا! لچھمن کہنے لگا ــــــ ایک دن ــــــ کہ اب تو میرے ساتھ بدنام ہو ہی چکی ہے ــــــ چل کہیں بھاگ چلیں ــــــ یہ جیون آنند میں کٹ

چل جائے گا، بڑے آنند میں ۔۔۔!

یہی ہوا بن کہے سنے ایک دن رات کو اندھیاری چھائی ہوئی تھی۔ لچھمن نے جب سیٹی بجائی تو میں دبے پاؤں باہر نکل کر اس کے ساتھ ہو لی ۔۔۔ دونوں چپکے چپکے چل رہے تھے ۔۔۔ ذرا سے کھٹکے پر ٹھہر جاتے! سویرا ہوتے ہوتے ایک باغ میں جب پہنچے تو اس نے مجھے ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں بٹھا دیا! دن بھر وہ میری پاس بیٹھا رہا! بڑا پریم آنند تھا ۔! ایسا جیسا اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ۔۔۔ شام کو اسٹیشن پہنچے، اور وہاں سے شہر!

ایک چھوٹی سی کوٹھری لیکر ہم دونوں بہت دنوں تک رہتے رہے! پھر ایک دن سپاہیوں نے پکڑ لیا دونوں کو! مقدمہ چلا۔ لچھمن کو سزا ہوئی ۔۔۔ اور میں یہاں پہونچ گئی!

اس نند و چاچا کو سبھی چاچا کہتے ہیں۔ اس لئے میں بھی کہتی ہوں ۔۔۔

پر ایک دن اس نے بھی وہی بات کہی جو سب کہتے ہیں ۔۔۔ میں نے کہا چندرو چاچا ۔۔۔ اگر تم نے اب کی ایسی بات کہی تو اپنے حوالدار سے کہدوں گی ۔؟

بڑی دیر تک کھڑے کھڑے وہ یہی سب کچھ سوچتی رہی!

چندرو جلدی جلدی مٹر کچالو کے دانے بنا کر بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ جے شری اگرچہ بہت پہلے آچکی تھی۔ لیکن اسے وہ دیر ہی میں سودا دیتا تھا۔!

سارے چکلے میں چندرو چاچا کی چاٹ بہت مشہور تھی ۔۔۔ اور کھٹ مٹھی پھلکیاں تو اتنی زیادہ کہ اس سے زیادہ کوئی دوسری چیز نہ بکتی!

چار چار آٹھ آٹھ آنے کر کے رات بھر میں یہ سب کتنا کما لیتی تھیں ۔۔۔ کوئی انتہا نہیں! دو دو روپیہ کے پیسے جمع ہو جاتے تھے! اگر تاڑی اور شراب پی پی کر

یہ سب گاہکوں کے لئے قہقہے، گالیاں ——— اور شگفتگی پیدا نہ کرتیں تو بڑی دولت جمع ہو جاتی ——— مگر سوال تو یہی تھا کہ گاہکوں کو لبھانے کیلئے قہقہے اور مسکراہٹیں پیدا بھی ہوتیں تو کیسے جب تک شراب اور تاڑی کا نشہ بدمست نہ کر دیتا ——— یہ ایکٹنگ بھی تو ممکن نہ تھی۔

چندرو کا خوانچہ خالی ہو چلا تھا ——— میلی کچیلی ساریوں اور جمپروں میں لپٹی ہوئی دق کی بیماریاں پٹے چاٹتی ہوئی اپنی غلیظ کوٹھریوں میں سمٹ رہی تھیں ——— جن کے اندر ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے ——— کچھ رات گئے! اندھیری رات کے سناٹے میں ——— شریف لوگ آتے تھے! کم خرچ بالانشین ——— وہ سوچتے ہوں گے کہ عورت عورت سبھی برابر ہیں! اس میں کیا کہ زیادہ دام خرچ کر کے گناہ کیا جائے ——!

پیسے بھی زیادہ خرچ ہوں اور بات وہی! پھر گناہ تو ہر حال میں اتنا ہی ہو گا ——!

کبھی کبھی انہیں ٹاٹ کے کثیف پردوں کے پیچھے بچھی ہوئی جھنگلہ کھاٹ پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے!

"چھوئے نہ دیبا ——— جوبنا ——— پٹے گاری دیبے ہو!"

ہلکے ہلکے سروں میں تاڑی کے نشہ میں بدمست بشیر اور اس کے سنگھی ساتھی گانے لگتے۔ دن بھر تانگے کے اسپرنگ دار گدوں پر بیٹھے بیٹھے ان کے چوتڑوں میں زخم پڑ جاتے ——— چونی کی تاڑی! ایک آنہ میں بیڑی پان ——— اور چار آنے؟ بس یہ سمجھو کل نو آنے میں زندگی کا مزا مل جاتا ہے! مزا۔

ڈھاک کے پتوں پہ چار آلو کاٹ کر چندرو نے کھٹائی اور مرچ ملاتے ہوئے کہا!

لے جاؤ ——— مہارانی ——— ہم پر بھی دیا کرو ———؟

چندر و نے ــــ ترچھی نظروں سے دیکھا ــــ جے شری دو نے سے چھٹی ہوئی تھی۔

چاٹ مصالحہ کی! چندر و نے ایک تان لگائی۔ اور خالی خوانچہ اُٹھا کر چل دیا ــــ

جے شری کا مُنہ مرچ کی تیزی سے بھنّا اٹھّا! گلی میں لگے ہوئے بمبے کے پاس پہونچکر اس نے چلّو بھر بھر کے پانی پینا شروع کر دیا ــــ نہ جانے وہ کتنا پانی پینا چاہتی تھی!

" کیا سارا بمبا پی جائیگی " چمپا نے میلی ساری میں صابن رگڑتے ہوئے کہا؟

جے شری نے ہاتھ روک لیا! جیسے اسکو خود بخود خیال آ گیا۔ کہنے لگی!

ہاں دیدی ــــ یہ تو بتا میں نے ایک بات سُنی ہے! ــــ سنا ہے کہ تو میرے حوالدار پر ڈورے ڈال رہی ہے!

" کون کہتا ہے " چمپا نے پوچھا!

کوئی کہتا ہے! " وہ بولی " تو بتا کیا یہ جھوٹ ہے؟

اگر جھوٹ نہیں ہے تو " چمپا نے جواب دیا " تو سچ بھی نہیں!

کیا مطلب؟ جے شری نے کہا!

مطلب یہی " چمپا بولی " وہ تیرا حوالدار آیا تھا اس دن! کہتا تھا کہ تو مجھ سے تعلق کر لے!

پھر ــــ پھر ــــ تو نے کیا جواب دیا۔ جے شری نے پوچھا!

" میں نے کہا ــــ وہ کہنے لگی! کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں ــــ!"

حوالدار نے کہا —— جے شری کے کان بجنے لگے! جب لچھمن کے ساتھ وہ پکڑ کر تھانے لیجائی گئی تو لچھمن حوالات کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا —— اور حوالدار اسے اپنے کواٹر میں لے آئے! یوں تو رات کو تھانے کے سبھی سپاہی باری باری آئے —— مگر حوالدار نے قول کیا تھا کہ وہ زندگی بھر نباہ دیگا —— اپنے گھر میں اس وجہ سے نہیں رکھ سکتا کہ وہ سرکاری نوکر ہے! پھر بیوی بچے بھی ہیں —— چکلے میں ایک کوٹھری لے دی تھی اور سارا خرچہ پورا کر رہا تھا —— یہی وجہ تھی کہ چکلے بھر میں کوئی اس کیطرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ سب ڈرتے تھے کہ اگر کہیں حوالدار نے سن لیا تو سزا ہی کرا دے گا جیل کی:—— اور خود جے شری بھی حوالدار کے سہارے پڑی ہوئی تھی —— ورنہ سارے چکلے میں پچاسوں آدمی روزانہ آتے جاتے ہیں —— وہ چاہے جو کچھ کرتی۔

جے شری! چپ چاپ اپنی کوٹھری میں چلی آئی۔ دروازے بھیڑ کر اس کھاٹ پر لیٹ رہی جس پر حوالدار اس کی ہڈیاں پسلیاں توڑا کرتا تھا۔ روز آدھی رات کے بعد جب وہ گشت میں نکلتا تو اِدھر اُدھر ایک آدھ سیٹی بجا کر جے شری کی کوٹھری میں آجایا کرتا —— اور کچھ رات گئے تھانے لوٹ جاتا! الگنی پر پڑی ہوئی بسنتی ساری کی طرف اس نے دیکھا! یہ حوالدار نے اسے لا کر دی تھی۔ کسی کپڑے والے کی دکان سے یونہی اٹھا لایا تھا دام بھی نہیں دیئے، ساری کے پاس ہی جمپر پڑا ہوا تھا بہت میلا کچیلا! اور وہ دھو کر بھی اسے کیا کرتی! سنگھار کی ضرورت ہی کیا ہے نئے گاہک تو ڈھونڈنا نہ تھے —— ایک حوالدار تھا —— وہی کافی ہے سب خرچہ اسی سے نکل آتا تھا۔ زیادہ جھمیلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا! اس نے سوچا لچھمن کہتا تھا کہ گھبرانا نہیں! ایشور نے چاہا تو جلد ہی جیل کاٹ کر آجاؤں گا —— جلدی

ہی اشاندو ہی تین سال کی ہوئی ہے سزا —— وہ نردوش تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ بھاگنے پر راضی نہ ہوتی تو وہ کیسے مجھے بھگا لاتا —— ! مگر جب تک وہ چھوٹ کر نہیں آتا پیٹ بھی بھرنا ہے اور تن بھی ڈھاپنا،

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن محبّت میں ساجھے دار نہیں بنا سکتی! جے شری کے دل پر بھی حوالدار کی بے اعتنائی سے ایک چوٹ سی لگی۔ وہ سوچنے لگی آج رات کو جب حوالدار آئیگا تو صاف صاف کہہ دوں گی کہ اسی بیسوا چمپا کے یہاں جائے —— میری سوت کے پاس! جس سے اقرار کر آیا ہے —— کہوں گی —حرامی سے —کہ تو تو کہتا تھا کہ اگر تو کسی اور کے پاس جائیگی تو جڑ موڑ سے ناک کاٹ لوں گا! —— کہو تو اب تمھاری ناک دانت سے کاٹ لوں حوالدار صاحب —— ! اور یہ ہرجائی چمپا کیا نباہ سکے گی اس حوالدار کے بچے کو! جس نے کسی کالے گورے کو چھوڑا ہی نہیں —— کمینی —— بد ذات! چاچا کہتی ہے مگر چندر و چاٹ والے پر بھی بند نہ رہ سکی —— کہتا تھا اس دن چندر و چاچا —— کہ چمپا کو میں نے پورے سولہ گنڈے دیئے تھے —— تو بھی لے لے ——! جے شری۔

دونوں وقت مل رہے تھے۔ جے شری جب اپنی کوٹھری سے باہر نکلی! ساری گلی میں سب رنڈیاں بناؤ سنگھار کر کے اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازوں میں بیٹھ چکی تھیں —— میلی میلی ساریاں پہنے —— ملگجے جمپر! پچکے ہوئے گالوں پر جاپانی پاوڈر —— اور لبوں پر سرخیاں چمک رہی تھیں —— کاجل میں رنگی ہوئی آنکھیں ہر آنے جانے والے کو دیکھ کر بار بار کھلنے اور بند ہونے لگتیں تھیں —— بے جھجک کھانس کھنکار کر وہ خواہ مخواہ راہگیروں کو متوجہ کرتیں۔ جن میں سے بہتیرے کھانس کھنکار کر اشاروں کا جواب دے رہے تھے —!

چندرو چاچا شام کا خوانچہ سجا کر بمبے سے کچھ دور پر آ گئے تھے ـــــ اس وقت ان کی بکری بہت ہوتی تھی۔ ہر ایک تماشبین آنے دو آنے کی چاٹ بیکر ضرور کسی نہ کسی رنڈی کو کھلا دیتا ـــــ چندرو چاچا ان جھوٹے پتّوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھکر سوچا کرتے کہ اس دوّنی کی چاٹ ـــــ کامنی نے کھائی تھی ـــــ اس کی گنّو نے! اس میں شکورن نے ـــــ اور اس میں چمپا نے ـــــ یہ پتّہ جے شری کا چاٹا ہوا ہے ـــــ جیسے وہ اپنے کو جے شری سے بہت قریب سمجھنے لگتے! ـــــ حوالدار کا ڈر ہے نہیں تو ایک دن زبردستی ـــــ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے ایکدم سے وہ آواز لگا دیتے ـــــ

چاٹ مصالحہ کی ـــــ دہی کے بڑے ـــــ مٹر کابلی ـــــ پھلکیاں

ـــــ گرم سیو!

جے شری نے کارنس پر رکھی ہوئی مٹی کے تیل کی ڈبیا جلا دی ـــــ اور اسی سے ایک بیڑی سلگا کر چندرو چاچا کے پاس پہو بچ گئی ـــــ چندرو چاچا نے مٹر کے دانوں کو دونوں ہاتھوں میں اچھالتے اچھالتے ایک چھلکتی نظر سے اسے دیکھ لیا ـــــ وہ بیڑی کے لمبے لمبے کش کھینچ رہی تھی۔ اُس نے دھیلے کی مٹر کیلئے بھی چاچا سے نہیں کہا تھا ـــــ اس کی نگاہیں خوانچے کی اس تھالی میں ناچ رہی تھیں جس میں سے ادھنے، پیسے اور اکنیاں اُبل پڑنے کیلئے بیتاب نظر آ رہی تھیں۔ ـــــ اسے خیال آیا ـــــ ہو گا حوالدار کا بچّہ ـــــ! چندرو چاچا سے مالدار تھوڑا ہی ہے ـــــ کیا کاٹ لیگا ناک! میں خود اس حرامی کی ناک کاٹ لوں گی دانت سے! ـــــ آج کہہ دوں گی چندرو ـــــ چا ـــــ چا ـــــ سے کہ ـــــ...... کوئی میرا دہ سچ مچ چاچا تو ہے نہیں۔ یوں ہی جیسے سب رنڈیاں اس کو چاچا کہتی ہیں میں بھی کہہ دیتی

ہوں ——— پھر کون بھتیجی اپنے چندرو چاچا کے پاس نہیں رہی ہے ——— گنو خود کہتی تھی کہ چاچا اس کے یہاں بہت دنوں آتا جاتا رہا! پر ان پولیس والوں کا بھروسہ ہی کیا ——— اگر کل کہیں بدلی ہو گئی تو بس بات بھی نہ پوچھیں گے! اور چندرو چاچا سے اگر نبھ گئی تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آنند ہی آنند ہیں ———!

آدھے سے زیادہ خوانچہ صاف ہو چکا تھا ——— چندرو چاچا نے دیکھا وہ اب تک کھڑی تھی۔ جلدی سے ایک دونے میں چاٹ بنا کر بڑھا دی!

لو ——— چاٹ ہی مانگی تھی نا ——— تم نے!

نہیں تو ——— جے شری نے کہا ——— میں نے تو کچھ نہیں مانگا!

خیر ——— کھا ڈالو ——— ا...... وہ کہنے لگا! کھالو۔ کھالو! نہیں ——— جے شری بولی! نہیں چندرو چاچا...... چاچا کہتے کہتے وہ رک گئی! مجھے تم سے کچھ کام ہے چندرناتھ ———!

مجھ سے "چندرو بوکھلا سا گیا" کیا کام ہے مجھ سے ———؟

ہے ایک کام ——— اس نے کہا! رات کو آنا بتاؤں گی!

نہیں ابھی بتا دو "چندرو بولا" مجھے چین نہ پڑیگا جے شری ——— جلدی بتاؤ کیا کام ہے ———؟

گھبرانے کی کیا ضرورت! جب آؤ گے بتا دوں گی۔ جے شری نے کہا! ——— آؤ گے نا رات کو ———؟

ہاں......... ہاں! چندرو نے جواب دیا ——— ضرور ——— ضرور

جے شری اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ پاس والی کوٹھری میں زیادہ مجمع تھا ——— گاہکوں کی بھیڑ! تاڑی کے نشہ میں بدمست تانگے والے اور مزدور ——— دن بھر ملول

اور کارخانوں میں کام کر کے تھوڑی دیر کیلئے ایک کیف آور سکون چاہتے تھے! ایسا سکون جو دن بھر کی کسل اور تھکن دور کر دے ۔۔۔! یہ سب نئے رنگروٹوں کی طرح ایک ہی کوٹھری میں گھس آئے تھے جہاں ایک دو گئی گذری جوانیاں کثیف اور میلی کچیلی ساریوں میں اپنے پچکے ہوئے گالوں سے نوجوانی کا فریب آگیں راگ الاپ رہی تھیں ۔۔۔ وہی سنی سنائی فلمی چیزیں!

"میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔!"

"میرے چاند ہے آجا ۔۔۔ تو کونسی بدلی میں! میرے چاند ہے آجا۔"

"ہماری گلیاں ۔۔۔ ہماری گلیاں"

"پنگھٹ پر ایک چھبیلی ۔۔۔ پنیا بھرن کو آئی ۔۔۔ ای۔ ای ہائی"

بے تکی راگنیاں ۔۔۔! اور سوکھے قہقہے جے شری کی کوٹھری میں گھس آئے تھے۔ اس روشندان کی طرف سے جو خدا جانے کس لئے ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھی کے درمیان لگا دیا گیا تھا۔

جے شری کا جی چاہنے لگا کہ وہ بھی ان کی آوازوں میں اپنی آواز ملا دے ۔۔۔ اور زور سے چیخنے لگے ۔!

"اندھیریا ہو رات ۔۔۔ سجن رہیو کہ جیہو ۔۔۔ ہاں ۔ ہاں ۔"

اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے پاس کی کوٹھری سے تمام تماشبین خفا ہو کر چلے آئے ۔۔۔ وہ کچھ زیادہ دام مانگ رہی تھی اور یہ آدھے درجن آدمی ایک ہی روپیہ میں نپٹ لینا چاہتے تھے! اس نے سوچا ۔۔۔ کہ کوئی گیہوں تو بیچنے نہیں ہیں ۔۔۔ ایک روپیہ بڑا کیا ہے ۔۔۔ اسی طرح اگر دس بیس گاہک روزانہ آجائیں گے ۔۔۔ تو دو ڈھائی روپے کہیں نہیں گئے! مہینہ بھر میں ساٹھ ستّر مل ہی جائیں گے ۔۔۔

اور حوالدار کا بچہ تو پورے تیس بھی نہیں دیتا مہینہ بھر میں —— حوالدار کا بچہ ناک کب کاٹے گا —— میں خود دانتوں سے کاٹ لوں گی اس کی ناک —— آج آئیگا گشت میں تو دروازہ ہی نہ کھولوں گی —— بس ہیں اور چندرو —— چا —— چا —— ہو نگے! مٹی کے تیل کا دیا —— کنٹرول کی پابندیوں کی وجہ سے روتے روتے بجھ گیا تھا —— جب سے مٹی کے تیل کا راشننگ ہو گیا گھروں میں قبروں سے زیادہ اندھیرا ہو جاتا ہے! کوٹھری کا دروازہ بھیڑا ہوُا تھا ہر طرف دھوئیں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی —— اور وہ تیز تیز سانسیں لے رہی تھی بالکل سناٹے میں —— گلی میں آنے جانے والوں کی آہٹ بھی ساون بھادوں کی بوندیوں کی طرح تھم سی گئی تھی! جنگلہ کھاٹ میں کھٹملوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا —— گندہ خون وہ شائد پینا نہیں چاہتے تھے —!

زور زور سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں —— حوالدار روز اسی طرح دو چار سیٹیاں بجا کر چپکے چپکے قدم رکھتا ہوُا اس کی کوٹھری میں آجایا کرتا تھا۔ تاکہ لانگ بوٹ کی آوازیں دوسروں کے کانوں میں نہ پہنچے۔ بھاری بھاری لانگ بوٹوں کی آوازیں دھیرے دھیرے آنے لگیں —— اور کسی نے چپکے سے چمپا کی کوٹھری کا دروازہ کھولا —— اور پھر فوراً ہی بند کر لیا —!

جے شری کا ہاتھ لاشعوری طریقہ پر اپنی ناک کیطرف اُٹھ گیا —— حوالدار حرامی کی ناک —— جی چاہتا ہے دانت سے کاٹ لوں کمینہ کہیں کا —— کہتا تھا ناک کاٹ لوں گا تیری —— اگر کسی اور مرد کے پاس دیکھا۔

اسکی کوٹھری کے دروازے بھی دھیرے دھیرے چلنے لگے —!

ایک دوسرے سے الگ ہو کر پھر گلے مل گئے —!

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی —— کون چندرو —— چا —— چاچا کہتے کہتے وہ جھجک

گئی ـــــ!

موٹے موٹے لانگ بوٹ لکڑی کے سٹول سے ٹکرا گئے ـــ!

حوالدار نے ماچس جلا کر دیکھا ـــــ

اب تک جاگ رہی ہے ـــــ تو جے شری -؟

ماموں ذات

> ہر "ماموں جان" قسم کے آدمی کو تنِ تنہا سفر کرنے سے احتیاط کرنا چاہیئے، ورنہ ممکن ہے وہ "ماموں ذات" ہو جائے ؟ –

آپ یقین مان لیں کہ آگرے اور بریلی کے سفر کرنے والے ننانوے فی صدی پاگل نہیں ہوتے ؟ بالکل اسی طرح جیسے ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہو سکتی۔ ورنہ آپ جانتے ہیں یہ ریلوے والے صرف ایک ڈبے میں ایک ہی جانور بھیجا کرتے ان جگہوں پر ! اور آج کل ایسی گھما گھمی کی لڑائی میں تو ان چیزوں پر یقیناً کنٹرول کر دیا جاتا مگر میں تو عرض کر رہا ہوں لڑائی سے بہت پہلے کا قصہ ! جب ایک پورے جوان جہان انٹر کلاس میں تن و تنہا ایک عدد مسافر کا آگرے یا بریلی سفر کرنا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھا کہ حضرت آگرے جا رہے ہیں علاج کیلئے ! بریلی کے پاگل خانے میں آپ کے لئے سیٹ ریزرو ہو چکی ہے — !

"اٹاوہ" کے اسٹیشن پر بے زبان خروت نے گھبراہٹ میں "زنانے انٹر" پر ہاتھ مارا۔ رنگ برنگی ساریوں – کالے کالے برقعوں...... اور مارواڑی طرز کے گھونگھٹوں میں ہلچل مچ گئی۔

"سوجھتا نہیں ہے...... زنانہ ؟

"ز...... ا...... نا...... نہ"

وہ خفیف ہو کر پلیٹ فارم پر آگیا۔ بغل ہی میں مردانہ انٹر تھا ہم دونوں اندر چلے گئے!

تین برتھ کا مختصر سا کمپارٹمنٹ! دو قبلہ رُخ مردے لٹانے والی۔ ایک اُتر، دکھن۔ قبلہ رخ والی ایک پوری سیٹ پر ناشتے دان۔ لوٹا۔ گلاس۔ جوتا۔ اٹیچی صُراحی دو ٹرنک! پھلوں کی ایک ٹوکری اور تھرموس!

دوسری برتھ پر ہولڈال کے لٹکتے ہوئے تسموں سمیت ایک "سہاگ سیج" قسم کا بچھونا۔ سرہانے تلے اوپر دو اچھے خاصے ہٹے کٹے تکیے جن پر "ویلکم" اور "گڈ نائٹ" کے ٹریڈ مارک بنے ہوئے تھے۔ اور ان سب کے اوپر تین سو پچیس پونڈ کا شاید اس سے بھی زیادہ وزن کی کوئی چیز لٹا دی گئی تھی جس کو پہچاننے میں مجھے اور ثروت کو کافی دیر لگی!

وہ کہہ رہا تھا!

"افریقہ کا ہے"

میری رائے تھی

"گلگتہ کے "زو" سے بھاگ آیا ہے۔"

اس نے کہا!

"ہاتھ پاؤں تو آدمیوں جیسے معلوم ہوتے ہیں"

میں نے جواب دیا

"اجی کوئی نئی کہو...... یہ تو ڈاروِن بھی کہتے تھے!"

شائد...... کوئی سڑک کوٹنے کا آلا امریکہ والوں نے ایجاد کیا ہو!"

وہ بولا۔

"رہے نرے احمق ہی!...... اور بقر عید میں کیا ہوگا...؟

یہ مسئلہ ابھی ہلکی ہلکی مسکراہٹوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ دونوں سیٹ کے بیچ میں رکھے ہوئے "پیچوان سے خود بخود نونگی کے نگاڑے کی ایسی آواز آنا شروع ہو گئی۔

کڑ...... کڑ...... کڑ...... کڑا...... ٹرا...... ٹرا...... کڑ......، کھو!......

کھوں...... کھی...... کھ"

سارے کمپارٹمنٹ میں رُلانے والی گیس کا دھواں بھر گیا۔ ثروت بو کھلاہٹ میں قریب تھا کہ اوندھے منہ گر پڑے انپر! میں نے سہارا دیکر بٹھا لیا۔

جس طرح چینا بطخ سطح آب پر تیرتی ہے...... بالکل اسی طرح سہاگ سیج پر پھسل رہے تھے! اور کڑ...... کڑ...... کڑ...... ٹرا...... کڑ...... کر!...... ک...... ا...... ڑ"

"اجی حفت (حضرت) یہ کونسا اسٹیشن ہے!"

ہڈیوں سے بنی ہوئی پوری بتیسی منہ کے باہر جھانکنے لگی۔

"جی...... حفت...... "یہ اٹاوہ ہے"

میں نے کہا!

پھر۔ کڑ...... کڑ...... کڑ...... شروع ہو گئی اور کھڑکی سے منہ نکالکر......

کھوں...... کھوں...... کھوں!"

ذرا سی تکلیف ہوگی...... جا...... ناپ کو...... پاندان دیجئے گا!

ثروت نے بڑھ کر نہایت سعادت مندانہ طریقہ پر پاندان ان کی طرف بڑھا دیا!

اور نہایت میگنیٹ سائز کے موٹے موٹے پان بنا کر مراد آبادی اگالدان جیسے چوڑے چکلے گلوں میں دبائے گئے...... اور پاندان بند ہو گیا!

"آپ کہاں تشریف لیجائینگے"؟
مُلّب مُنہ سے تھوک کی چھینٹیں اڑنے لگیں!
"جی بس! یہی دلّی تک!
ثروت کو خیال گذرا کہ شاید پان کھلا دیں۔

"خوب"
کھڑکی سے مُنہ نکال کر جگالی ہونے لگی۔!
"اور....... جناب"
ثروت اب بھی مستقل مزاج تھا۔!
"آگرہ.......!"
بمشکل تمام گردن مُڑ سکی۔
اور پھر اطمینان سے "پاگر" شروع ہوگیا۔
ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ اور ثروت سوچ رہا تھا کہ شائد اب
کہیں "بسم اللہ نوش فرمائیے"
"جی..... حُقّہ سے تو آپ شوق فرماتے ہونگے" ماحضر تناول........ آپ
کا دولت خانہ....... ہائیں۔ آپ....... انڈا نوش نہیں فرماتے! شادی ہوگئی آپ
کی..... ہاں....... ہاں یہ کباب میری لڑکی نے پکائے ہیں...... صاحب بڑی خوشی
ہوئی آپ سے نیاز حاصل کر کے! کیا شغل ہے جناب کا؟
— زور زور سے اس کے کان بج رہے تھے اور ادھر وہی...... جگالی اور

مجھے رہ رہ کر تاؤ آرہا تھا۔ کتنا احمق ہے یہ بھیّا بے زبان! وہ جانور...... جی

توبہ کیجئے! پان کو پوچھے گا، حقّہ بڑھائیگا اس طرف لعنت ہے منحوس کی صورت پر! خدا ہی ہے جو آج روٹی ملے! صورت دیکھی ہے ایسے شوم کی! لاحول ولا......!

میں نے ثروت کی طرف گھور کر دیکھا...... وہ ...... آدمی سمجھدار تھا گو کہ تھا بھیّا بیزبان! مگر سمجھ گیا کہ مجھے غصّہ آرہا ہے اس خوتق پر......! اور نہ مجھے اس کی باتوں سے خوشی نہیں ہوئی......!

واقعی اس بدتہذیبی کی حد بھی ہتی کوئی۔ سارے کمپارٹمنٹ کو گھیر رکھا ہے۔ کمبخت نے! اور پھر پان تک کو نہیں پوچھتا...... ثروت نے معنی خیز نگاہیں ڈال کر پوچھا......!

پھر......!

بیٹھے رہو...... دیکھو...... چچا کو چچا بنا کر نہ چھوڑا...... ہو تو کہنا۔!

میں نے چپکے سے کہا وہ مسکرانے لگا...... ان کی طرف دیکھکر! وہ بدستور کھڑکی سے مُنہ نکالے ہوئے "جگالی" فرما رہے تھے...... ہم لوگوں کی بات چیت پہیّوں کی بے ہنگام کھڑکھڑاہٹ میں گم ہوگئی۔

درجہ بھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ گاڑی کی رفتار دھیمی ہونا شروع ہوگئی ہندو پانی...... مسلم پان! پوری مٹھائی۔ بابو جی قلی...... اجی گارڈ صاحب ٹھہریئے گا...... میں ٹکٹ لیلوں! دو آنے درجن کیلے۔ کی آوازوں سے معلوم ہوگیا ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ ٹرین رُکتے ہی پھر گڑ...... گڑ...... کر حقّہ بولنے لگا۔

"قبلہ" نے سیاہ کلکتیا سلیپر کے منہ میں دونوں "گوڈر" ڈالدیئے۔ اچھے خاصے تن و توش کے واقع ہوئے تھے۔ خضاب سے رنگی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی، مہین کتری ہوئی مُوچھیں اور بالکل انگریزی طریقہ پر کٹے ہوئے بال! بیس چھبیس سائز توند

کے توند پر ململ کا کرتا اس طرح مڑھا ہُوا تھا جیسے ہندوستان کی قسمت پہ " ہوائٹ پیپر "
لپیٹ دیا گیا ہو........ ریشمی آزار بند سے کسے ہوئے غرارے دار پائجامے سے "توند"
کے مدوجزر کا کچھ کچھ پتہ ضرور چلتا۔۔۔!

سیٹ پر سے پانی کا لوٹا اٹھالیا گیا۔

کڑ...... کڑ...... کڑ...... پھر کو...... کھوں...... کہ...... کھوں!

اوگالدان جیسے مُنہ سے دھوئیں میں لپٹی ہوئی عجیب عجیب قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔

گارڈ نے ہری جھنڈی دکھلائی۔ وسل بجائی...... ہاتھ ہلایا۔ ٹرین چلنے لگی۔

...... بھک...... بھک...... بھک...... ! "حضرت نے کھڑے کھڑے
ریشمی آزار بند کو ڈھیلا کرتے ہوئے حقّے کے دو چار کش اور مار دیئے!

معلوم ایسا ہوتا تھا، کہ دمہ، قبض اور پُرانے قسم کے بواسیر کا شکار ہیں جب
تک دو چار حقّے جلا نہیں لیتے۔ پاخانہ ٹسکتا ہی نہیں! اجابت ہی نہیں ہوتی گھنٹوں
پائخانہ میں بیٹھتے ہوں گے جب کہیں جاکر......!

میں نے سوچ لیا۔ جائیں تو قبلہ پائخانے! اگر آج ان کی ساری بدتہذیبی
نہ بھلادی ہو تو...... کوئی بات ہی نہیں ہے!

بس یہی وقت ہے! موقعہ پر چوکنا سخت غلطی اور حماقت...! ساری تدبیریں
سمجھ میں آچکی تھیں جیسے ہی تشریف لے گئے پائخانے میں۔ مَیں نے جلدی سے
پھلوں کی ٹوکری سے رسی کھولکر پائخانے کے دروازے کو نہایت مضبوطی کے ساتھ
جکڑ دیا ہے!

نہ یہ...... اندر...... کھانس بھی رہے تھے...... اور کانکھ بھی ہے!

ثروت بھیا بے زبان کی طرح بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔
"ارے کمبخت کیا دیکھ رہا ہے....... جلدی سے ناشتہ دان کھول۔ پہلے اس فرض سے سبکدوش ہو لیا جائے!"
ثروت نے ناشتہ دان کے ڈونگے نکال نکال کر سیٹ پر لگانا شروع کر دیئے اور میں نے جلدی سے تھرموس کھولکر دو گلاس پانی بنا ڈالا۔
آپ خیال فرمائیں کس قدر تکلف کیا گیا تھا ہم لوگوں کیلئے! مسافر نوازی کی انتہا تھی بس۔
"مرغ مسلّم، پراٹھے، شامی کباب، قیمہ، انڈوں کا خاگینہ، روغنی ٹکیاں مٹھائی پوری ...... اور نورتن چٹنی۔
"بھیا بے زبان" کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے کہا آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔
غور تو فرمائیے۔ ہم لوگ تھے تو انسان ہی! دونوں نے ملکر کھانا شروع کیا لیکن کہاں تک کھاتے ان کی نانڈ کو۔
بہرحال کوشش کی اور سانڈوں کی طرح خوب ڈٹ کر کھایا۔ دل میں سوچ لیا تھا۔ کہ چاہے جیا جلے...... رام ہو........ چاہے جیا جائے! لیکن اس کے باوجود بھی بچ رہا۔ اور اچھا خاصا۔ کیونکہ ابھی پھل بھی تو باقی تھے۔
ظاہر ہے کہ پھل کہاں تک چلتے۔ ڈکاریں تک تو آنا بند ہو گئی تھیں پیٹ تھا کہ "کورک ٹیڈ" ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی کفرانِ نعمت جیسا گناہ بھی مول لینا نہیں چاہتے تھے! چند موسمیوں کا عرق نچوڑ نچوڑ کر پینا ہی پڑا۔
پائخانے کے اندر سے برابر کھانسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شائد

رنجش شکنی، ہنوز باقی تھی؟

ثروت پان لگانے میں اُستاد تھا۔ پھر برقی قوام کیساتھ پان، سفید الائچیوں کے ساتھ پان، تمبولین کے ساتھ پان........ زعفران اور بالائی ملے ہوئے چونے کیساتھ پان......!

"بھیا بیڑہ پان — میں نے کہا۔ دلی تک سفر کرنا ہے ذرا خیال رکھنا...... راستہ میں کم نہ پڑ جائیں۔

گھر تک کام دینگے۔

وہ بولا۔

"شاباش اُستاد"

واقعی اس نے سارے پاندان کا صفایا کر دیا تھا۔

پان وان کھا کر حسب اطمینان کے ساتھ میں نے "گڈ نائٹ" والے تکیہ پر سر رکھا تو سُرور سے آنکھیں بند ہونے لگیں...... رزّاق مطلق........ اور ربِ بے نیاز...... کی قدرت کا کرشمہ نظر آنے لگا۔...... صدقے تیری شانِ کبریائی کے ...... کہاں ہمارا مُنہ ...... اور کجا یہ نعمات......!

اللہ بخشے خواجہ آتش مرحوم بھی کیا خوب فرما گئے تھے۔ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں!

میں اسی سجدۂ شکر میں محو تھا اور ثروت جمائیوں پر جمائیاں لے لیکر اونگھ رہا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے تار بابو کوئی میسج دے رہے ہیں۔

"کھٹ...... کھٹ...... کھٹا کھٹ...... کھٹ"

آوازیں بے تکان آ رہی تھیں۔ غور جو کیا...... تو معلوم ہوا کہ یہ بات نہیں ہے پاخانہ کا دروازہ اندر سے کھولا جا رہا ہے!...... مگر وہ کمبخت جنبش ہی نہیں کھاتا......
...... اللہ جانے کیا معاملہ!

"حضرت" (حضرت) ذری دروازہ...... کھول دیجیئگا......!

ہانپتی ہوئی پاٹ دار آواز پائخانہ کے اندر گونجنے لگی۔

میں نے مسکرا کر ثروت کی طرف دیکھا...... اور لاپرواہی سے حقہ کی نے ہونٹوں میں دبالی گڑ...... گڑ...... گڑ...... ڑا...... ڑا...... ہٹ...... کھٹ......
...... کھٹا کھٹ...... کھٹاک......

پائخانہ پر جو ہوائی حملہ کی مشق ہو رہی تھی اس کی ناہموار آوازوں میں حقے کی صدائیں بھی گم ہو گئیں۔!

جناب...... ذری...... دروازہ...... آپ کو زحمت ہوگی!

اندر سے پھر آواز آئی۔

ہم لوگوں نے اس "دخل در معقولات" قسم کی سمع خراشی پر کوئی توجہ نہیں کی۔...... حقہ بڑے مزے میں آرہا تھا...... مگر مجبوری تو یہ تھی کہ جو سانس باہر آتی اس کا واپس جانا مشکل تھا۔ چہ جائیکہ حقے کے خوشبودار گھونٹ اور...... رہ رہ کر یہ غم اور بھی کھائے جاتا تھا کہ ہائے پھلوں کی ٹوکری بھری کی بھری ہی ہے۔

"پائخانہ" کا دروازہ انتہائی جوانمردی کے ساتھ توڑا جا رہا تھا...... مگر جناب آخر اگر یہ ریلیں ایسی ہی "جاپانی" بنائی جاتیں تو آپ خود سوچیے۔ آج اتنی لڑائی کاہیکو چھڑ جاتی! بس جھگڑا تو اسی بات کا ہے۔ جاپان والے کہتے ہیں کہ ریلیں، ہوائی جہاز موٹر، تانگے، یکے، شکرم، بیل گاڑی، کوٹھیاں، مکانات، بنگلے، سینما وغیرہ

سب کچھ ٹین اور چیڑ کے تختوں سے بنائے جائیں اور ان کی مرمت "گوند" لگا کر ہوا کرے ...... اتحادیوں کی رائے ہے کہ جو کام کیا جائے ...... پائدار ہونا چاہیئے ...... روز روز کا جھگڑا ٹھیک نہیں! اصل پوچھیئے لڑائی کی وجہ یہی ہے ورنہ ...... ورنہ بات ہی کیا تھی!

تو ...... خیر ...... رہ رہ کر زور لگ رہے تھے اور نئی نئی طرح سے "ڈائیلاگ" پکارے جا رہے تھے۔

"اجی حضت (حضرت)"

"جناب والا"

"بابو جی"

"مسٹر"

"بابو صاحب"

"اجی سُنیئے"

"ارے میاں صاحبزادے"

"بھائی ...... جان"

"اے بھیّا"

"جناب من"

اور خدا جانے کیا کچھ کہہ کر ہم لوگوں کی خوشامد ہو رہی تھی ...... مگر ...... ہم کہاں کے ایسے گئے گذرے تھے جو آ جاتے اُن کے جھانسے میں! "بڑی مشکلوں سے تو پھنسے تھے چچا" میں اور کھول دیتا دروازہ! بھیّا بے زبان نے چپکے سی پوچھا۔

"اب کھول نہ دیا جائے"

"جی...... بہت خوب! معلوم ہوتا ہے چندیا کھجلا رہی ہے"

میں نے جواب دیا وہ خاموش ہو گیا۔

اب گاڑی کی رفتار میں کچھ کچھ آہستگی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی!

چند ہی منٹ میں پوری ٹرین کی ٹرین پلیٹ فارم کے پہلو میں بل کھاتی ہوئی پہنچ گئی! اور قلیوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔...... بڑے میاں نے پاخانے کی کھڑکی سے پلیٹ فارم کی طرف تھوتنی نکالدی!

قلی ۱۸؎ جا رہا تھا۔

قلی...... او...... قلی والے ——!

مڑ کر دیکھا قلی نے! اتنے موٹے آدمی کا سامان بھی ایسا ہی ڈبل ہو گا۔ غالباً۔؟

"بھائی...... ذرا...... پاخانہ بند ہو گیا۔ کھولدینا...... میاں!"

مُنہ بسور کر رونی شکل بنادی۔

آدمی تھا قلی بھی! ایک ذی رُوح پر مصیبت دیکھ کر اس کا دل پگھل گیا۔ کھڑکی کھول کر اندر آیا ہی چاہتا تھا کہ میں نے للکارا ——؟

"ابے...... واہی ہُوا ہے! چل اپنا کام کر...... اتنی مشکلوں سے تو ہم دونوں نے مِلکر بند کیا ہے......! اگر...... ان کی طبیعت اچھی ہوتی تو بند کا ہیکو کئے جاتے!

میں نے معاملہ کی نزاکت سمجھا دی۔ اس نے مُنہ پھیر کر دیکھا بھی نہیں۔ بھاگا جی لیکر اپنا۔

"پلیٹ فارم" ہی تو تھا۔ کئی آدمی نکل گئے! بعض نے دیکھا اور بعض نے نہیں! ایک دو نے دیکھ کر بھی مُنہ پھیر لیا...... آخر ایک انسان نما بابو جی کو ان سے

ہمدردی پیدا ہی ہو گئی۔ قریب تھا کہ وہ انٹر کلاس میں آکر "جانگلوش" کو کھول دیں۔
"ارے ...... رے ...... رے! یہ آپ کیا کر رہے ہیں! میں سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ ماموں جان کو دورہ ہو گیا ہے ...... آگرے پہنچانا ...... مشکل ہو جائے گا مشکل ہے۔ بابو جی ـــ!

وہ بیچارے سٹ پٹا گئے! ان کا ہاتھ رُک گیا۔

آپ کے ماموں ہیں ...... کوٹھا اتر گیا ہے میرے خیال میں!

آہستہ سے بولے۔

"جی ہاں ...... اسی لئے تو کہہ رہا ہوں ...... ورنہ کون اپنے ماموں جان کو پائخانہ میں بند کر دیتا۔ بھلا ـــ!

میں نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا ـــ!

"پائخانے" کی کھڑکی کے پاس ہی یہ بات چیت ہو رہی تھی ...... شاید انہوں نے سُن لی

"صاحب بکنے دیجئے ...... ان بدمعاشوں کو ...... میں ہرگز ان کا ماموں نہیں ہوں۔

اندر سے بولے۔

میں نے بابو جی کو نوٹ کرا دیا۔

"اب دیکھ لیجئے! ان کی باتیں ...... جیسے ماموں کہیں سے بن کر آئے ہیں! کہتے ہیں میں ان کا ماموں نہیں!

چٹخے ہوئے شیشوں کی عینک سے بابو جی نے جھانکا! اور چپکے سے پلیٹ فارم کی طرف سدھارنے لگے!

"چھ ...... چھ ...... چھ یہ مرض بھی کتنا بُرا ہوتا ہے اپنے پرائے سب بُرے ہو جاتے ہیں"!

میں پاگل نہیں ہوں ...... بدمعاشو! ...... میں تمہارا ماموں نہیں ہوں ہرگز نہیں! ...... یہ چور ہیں ...... شریر ...... لُچے ...... بند کر دیا ہے مجھکو ...... میرا دماغ ٹھیک ہے ...... یہی پاگل ہیں ...... میں ان کا ماموں ہرگز نہیں ...... ہرگز نہیں! خدا کی قسم نہیں! میں تو آگرے اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں"۔

آدھ گھنٹہ سے زیادہ دیر تک پائخانہ میں بے بسی کیساتھ پھڑپھڑاتے پھڑپھڑاتے وہ سچ مچ پاگل ہو گئے تھے۔ پسینے میں شرابور ...... اور مُنہ سے کف جاری تھا چیخ رہے تھے بدستور۔

میرے ڈبے کے سامنے اچھا خاصا مجمع تھا۔ اور ان کی چیخ وپکار سے سارا پلیٹ فارم گونج رہا تھا۔ کچھ لوگ ہنس رہے تھے کچھ افسوس کر رہے تھے ...... اور کچھ خیال آرائیوں میں محو!

"ایشور ...... موت دیدے ...... مگر پاگل نہ کرے"

"ہاں صاحب بڑا موذی مرض ہے کمبخت!"

"آگرے لیجا رہے ہوں گے یہ لڑکے؟"

"کب سے بیمار ہیں!"

مارنے تو نہیں دوڑتے!

"آپ کے حقیقی ماموں ہیں ...... نا ......؟"

"پہلی مرتبہ دورہ پڑا ہے ......! شائد ـــــ؟

"دکھیا ...... دکھیا کا کوٹھا اتر گیا ہے!"

"قبلہ" چیختے چیختے گالیوں پر اتر آئے تھے۔ مگران کی اس سراسیمگی و بدحواسی سے میری جیت پر جیت ہو رہی تھی ...... لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ بیانات بھی دینا ہی پڑے!

"جی.. بالکل حقیقی ماموں ہیں!"

"پچھلے سال بریلی میں رکھا تھا دو مہینے! کچھ فائدہ نہیں ہوا۔"

"بیمار تو بہت دنوں سے ہیں ...... لیکن اب کے ذرا سخت حملہ ہوا ہے....."

.... مارنے کو..... دوڑتے ہیں۔ کاٹ کھاتے ہیں۔"

"ادھر بڑے میاں" نے اپنی صفائی کیلئے لوٹا و کھایا۔ "میں تو پائخانے آیا تھا...... بند کر دیا......"

"ہٹیئے صاحب...... میں نہیں جانتا جو لوٹا کھینچ ماریں"

پبلک پر میرے اس کہنے کا کافی اثر ہوا۔ لوگ ہٹ کر فاصلے سے کھڑے ہو گئے۔ اور...... اور حضرت" نے زیادہ موٹی قسم کی برہنہ گالیاں شروع کردیں!

وہ جتنا بھی چیخ رہے تھے اتنا ہی ان کی دیوانگی کا یقین سب کو ہوتا جا رہا تھا۔ مسافر سمٹ سمٹا کر اپنے درجوں میں چلے گئے ...... اور گاڑی روانہ ہو گئی! مگران کے غصہ اور گھبراہٹ کا ٹمپریچر ...... بڑھتا ہی جا رہا تھا ...... اور باقاعدہ ...... گالیاں دے رہے تھے ...... بدستور!

"زنجیر کھینچ لوں گا .... ورنہ کھولو......!

دھمکی دی پائخانہ میں سے!

"ماموں ذات" اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔"

میں نے کہا۔!

ثروت بولا!۔

"پان...... تو نوش فرمائیے گا...... ماموں جان!"

" ارے بے ایمانو...... پان کھا لئے سب!...... ہائے خدا غارت کرے

......! دیکھو ابھی ٹرین رُکوا کر...... تم سب کو...... پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔

سچ مچ زنجیر کھینچ لی...... اور گاڑی رُک گئی...... ہانپتے ہوئے گارڈ صاحب چلے آرہے تھے!

" گارڈ صاحب...... یہی بدمعاش ہیں...... مجھ کو پائخانے میں بند کردیا میرے سب پان کھا لئے! گرفتار کر لیجئے ان کو...... بدمعاش...... چور ہیں!

" براہِ کرم...... گارڈ صاحب کنکشن الگ کردیجئے...... ورنہ یہ راستے بھر یہی کرینگے! آگرے پہونچنا مشکل ہو جائیگا......!

" میرے ماموں ہیں...... صاحب دماغ میں کچھ فتور...... آگیا ہے! علاج کیلئے لئے جارہا ہوں!"

اندر سے بڑے میاں جھنجلا جھنجلا کر تردید کر رہے تھے......

جھوٹے ہیں...... بدمعاش! ابے تیرے ماموں...... کی......!

نہ جانے کیا اُول جلول بک رہے تھے! ان کی گھبراہٹوں نے بہت ہی جلد گارڈ کو بھی یقین دلا دیا کہ زنجیر پاگل پن ہی میں کھینچی گئی ....

وہ...... اپنے ڈبہ کی طرف چلا گیا اور گاڑی پھر روانہ ہو گئی!

" ماموں ذات " آپ کے زنجیر کھینچنے سے کیا فائدہ ہؤا...... اب آپ کھینچتے رہئے زنجیریں...... ٹرین رُک ہی نہیں سکتی...... کنکشن...... ہی علیحدہ ہو گیا۔

میں نے پاخانہ کے دروازہ پر دستک دیکر عرض کیا......!

کیا معقول جواب دیتے ہیں......!

"میں...... تیرا...... ماموں نہیں...... باپ ہوں۔"

"غالباً شرم تو نہ آئی ہوگی آپ کو...... ماموں سے باپ بن رہے ہیں!"

میں نے جواب دیا......!

بولے!

آخر...... میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے...... جو مجھے تنگ کر رہے ہو!"

میں نے کہا:۔

"آخر...... ہم لوگوں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا...... جو پان کو بھی نہ پوچھا! حقّہ تک نہ بڑھایا۔ ناشتہ گول کر گئے! پورے ڈبّے کا ڈبہ چھاپ رکھا تھا آپ نے...... ...آپ نے یہ بھی توجّہ نہ فرمائی کہ یہ لوگ جو آئے ہیں اس کمپارٹمنٹ میں انکو بھی بیٹھنے کا حق ہے...... آخر کیا بگاڑا تھا آپ کا ہم لوگوں نے...... اس بدتہذیبی...... اور بداخلاقی کی کوئی حد بھی ہے!"

ندامت تو ان کو خاک محسوس ہوتی...... لیکن اپنی جان بچانے کی فکر ضرور تھی۔!

"بیشک یہ میری غلطی تھی...... آپ لوگ میرے چھوٹے ہیں معاف کر دیجئے ناشتہ پھل، مٹھائی سب وہیں رکھا ہے...... بسم اللہ شوق سے کھائیے آپ ہی کا ہے۔!"

"بڑے میاں کے لہجے میں بھی تبدیلی ہوگئی۔

خیر...... شکریہ! اس کی فکر آپ نہ کریں...... اس قسم کے ضروری

کاموں سے تو ہم لوگ پہلے ہی فرصت کر چکے ...... آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ ...... اور بہت بہت شکریہ !

"ٹونڈلہ" کا اسٹیشن آچکا تھا۔ ثروت نے جلدی جلدی کچھ پھل اٹیچی میں رکھے ! جیسے ہی گاڑی ٹھہری ہم لوگ پلیٹ فارم ...... کی دوسری طرف اتر کر دِلّی جانیوالی ٹرین میں بیٹھ چکے تھے ...... اور ہماری ٹرین آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی ۔

"جہاں بات بنائے نہ بنے"

ایک توئے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی! سچ پوچھئے تو آپا اور مجھ میں فرق ہی کیا تھا! ایک درخت کی دو شاخیں، ایک ماں کی دو اولادیں۔ جیسے بدن کی انگوٹھی پر آنکھوں کے دو نگینے۔ یہ اور بات تھی کہ میرا رنگ آپا سے کچھ کھلتا ہوا تھا۔ مگر اس کے یہ معنی بھی نہ تھے، کہ اللہ نہ کرے آپا کوئی ایسی کالی کلوٹی تھیں جن پر "بلیک آؤٹ" ہونیکا گمان کیا جائے۔ بس ذرا ڈوبتا ہوا سا گیہواں رنگ، بھاری بھرکم ڈیل ڈول اور چہرے پر ہلکے ہلکے داغ تھے۔ سو وہ بھی چیچک کے۔ لیکن اس دنیا میں ظاہری رنگ روپ دیکھنے والے تو بس یہ چاہتے ہیں کہ بدصورت لڑکیاں زندہ جان ہی قبر میں سلا دی جائیں۔ بد قطع سے بد قطع بدصورت سے بدصورت احمق چغد مردوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر تو نظر نہیں آتا، مگر دوسرے کی آنکھ کا تنکا کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتا ہے۔ آئینہ لیکر اپنا کوتار پھرا ہوا چہرہ نہیں دیکھتے لیکن اچھی سے اچھی نک سک کی لڑکی میں ہندی کی چندی نکالتے ہیں۔

پہلے پہل جب ہم لوگوں کے پیام آئے تو ہر طرف سے میرے ہی لئے زور ہونے

لگے۔ بعض نے کھلم کھلا بعض نے خوبصورتی کے ساتھ آپا میں عیب نکال کر یہی کہا کہ گوئی لڑکی سے کر دیجئے۔ امی جان کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور ہونی بھی چاہئے تھی جب تک بڑی بیٹی کا فرض ادا نہ کر لیتیں ان کو دنیا کیا کہتی پھر خدا جانے آپا کے بیاہ میں کیسی کیسی اڑچنیں لگتیں۔ ایک تو یوں ہی آپا میں سب عیب نکالتے تھے۔ اللہ جانے جب کیا کیا برائیاں نکالی جاتیں۔ زمانہ یہی کہتا کہ اگر یہ ایسی ہی ہوتیں تو کاہے کو یہ ہوتا کہ بڑی بیٹھی ہیں اور چھوٹی کا بیاہ ہو جائے۔

ابا جان ٹھہرے نئی روشنی کے! انہیں اس قسم کی دقیانوسی باتوں سے اللہ واسطے کا بیر۔ آئے دن امی جان سے یہی جھگڑتے کہ میں ان پرانی باتوں کو جہالت سمجھتا ہوں اس میں کیا جب ماشاء اللہ دونوں لڑکیاں بیاہنے کے قابل ہیں تو اس کا پہلے ہوا تو کیا۔ اور اس کا ہوا تو کیا ـــــ بیاہ تو دونوں ہی کا کرنا ہے۔ اس میں آگے پیچھے کا سوال ہی کیا ـــ امی جان رہ رہ کر سمجھاتیں مگر وہاں ایک نہیں ہزار نہیں۔ ادھر میری سسرال والوں نے ابا جان کی شہ پاتے ہی تقاضوں کی بھرمار کر دی۔ روز روز یہی ہونے لگا کہ اب صاحب دن تاریخ مقرر ہونا چاہیئے۔ دیر نہ ہونی چاہیئے۔!

امی جان نے تو پہلے ہی دن لکڑ دل کوں کا ڈربہ پھونک دیا ہوتا مگر ابا جان نے ان لوگوں کو شہ دے کر اتنا سر چڑھا لیا تھا کہ اب امی جان بھی ہمت ہار چکی تھیں۔ ادھر آئے دن کے تقاضے، ادھر کی ٹال مٹول! کوئی سال بھر تک یہی ہوتا رہا مجھے بھی اب بیسواں برس لگ چکا تھا، اور بیچاری آپا کو تو اکیسواں بھر کے بائیسواں شروع تھا۔ آخر ہوتے ہوتے ایک چپ چپاتی شام میں میرا نکاح اس شرط کیساتھ کر دیا گیا کہ میری رخصتی اور آپا کی رخصتی ساتھ ہی ساتھ ہوگی۔

اس قسم کے شادی بیاہ سچ پوچھئے تو ۔ گھر گھوڑا نخاس مول ہ کہلاتی ہیں

کہ بی بنّو تو پڑی میکے میں ایڑیاں رگڑ رہی ہیں اور میاں اِدھر اُدھر واہی تواہی گلیوں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ ان زندہ درگور لڑکیوں کا بھائی برادری میں جانا تو درکنار گھونگھٹ کی آڑ سے کسی باہری عورت کو دیکھ لینا گناہ اور گناہِ عظیم سے کم نہیں ہے۔ دن ہے تو کمرہ، رات ہے تو کمرہ۔ جاڑے، گرمی، برسات، باروں مہینے یہی قید خانہ ہے۔ اور یہ۔ یہیں کھانا یہیں پینا۔ یہیں سونا، یہیں جاگنا۔ بس ایک زندہ جان پر چوبیس گھنٹے کی جیل۔ نہ زندگی کے دن کاٹے کٹتے ہیں نہ موت آتی ہے۔

میرے نکاح کے بعد جیسا کہ اُمّی جان کا خیال تھا وہی ہوا۔ آپا کے پیام آنا بند ہو گئے۔ اور ایک آدھ جو آئے بھی تو وہ ایسے نہ تھے جن کو منظور کیا جاتا۔ کہیں حسب نسب کے ہیٹے۔ کہیں چال چلن کے کھوٹے۔ کوئی بوڑھا ورڈھا۔ کسی کے پاس بی، اے کی سند چھوڑ انٹرنس کا بھی سرٹیفکیٹ نہیں۔ اور کوئی نکھٹو بے روزگار۔ اب آپا ایسی بھی بھار نہ تھیں جن کو ماں باپ جان بوجھکر کسی گورگھٹے میں ڈھکیل دیتے۔ اُمّی جان کو دن رات یہ غم گھلائے دیتا۔ ابّا جان اسی سوچ میں سُوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے، مگر کیا کرتے۔ بیشمار اخباروں میں شادی کے اشتہار چھپوائے۔ اَن گنت شادی بیاہ کرنے والی کمیٹیوں کے ممبر بنے۔ سیکڑوں دوستوں کو خطوط لکھے۔ عزیز و اقارب سے کہا۔ دان جہیز کا لالچ دیا۔ لیکن حسب دلخواہ کوئی رشتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اوّل تو پیام ہی نہ آتے اور جو آتے بھی تو کہیں سے تصویر بصیغۂ راز مانگی جاتی۔ کوئی کہتا پہلے لڑکی دکھا دیجئے۔ کسی کو کورٹ شپ پر اصرار۔ کہیں یہ شرط کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دکھا دیئے۔ غرضکہ ایک عذاب میں جان تھی۔ شادی کا ہے کو بھی بیچاری آپا کے سہرے کے پھول نہ اب کھلتے تھے نہ جب نئی روشنی کی نئی نئی شرطیں۔ اُمّی جان تو اُمّی جان ابا جان کو بھی منظور نہ تھیں۔ جو ... دن فیشن کی رٹ لگائے رہتے۔ لڑکی دکھا دینے پر تو ابا جان راضی تھے۔ ان کا خیال

تھا تو اس بات کا کہیں آپا کو دیکھ کر لڑکے والے انکار نہ کر دیں۔ اُمّی جان چھوٹتے ہی ہزار ہتیں کہ چاہے بیاہ ہو نہ ہو میں نکاح سے پہلے لڑکی کا سایہ بھی نہ دکھاؤں گی چاہے جنم زندگی میری دھن یوں ہی بیٹھے رہے۔ یہ تو باوا دادا میں نہیں ہوا۔ میں کوئی نئی بات اپنے جیتے جی نہ ہونے دوں گی۔ اپنی جان دے دونگی۔ مگر یہ تو کسی طرح نہ ہوگا۔ بھاڑ میں جائے موا فیشن آگ لگے اس نئی روشنی کو، کنواری باری لڑکی مجھ سے تو نہ دکھائی جائیگی۔ نکاح سے پہلے۔ ہاں عزت و آبرو کیساتھ لڑکی سسرال چلی جائے میاں سو کوس پھرائیں، چاہے دشمنوں کو ٹھینگا نچائیں۔ زمین آسمان ایک کر دوں گی مگر اپنی آنکھوں تلے یہ نہ ہونے دوں گی۔ ابّا جان کہتے، بیگم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری تو وہی مثل ہے کہ، سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ کہیں سے شادی بیاہ طے بھی ہونے دو پھر سب کچھ کہہ لینا۔ جی میں آئے لڑکی دکھانا، جی میں نہ آئے نہ دکھانا۔ ابھی سے ایسی باتیں کر کے سارے جہان کے کان کھول رہی ہو کہ ہو نہ ہو لڑکی میں کوئی عیب ضرور ہے جبھی تو دکھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ بڑی سعی و سفارشوں سے اللہ اللہ کر کے ایک جگہ سے پیام و سلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ لڑکا پولیس میں تھانیدار تھا دوہاجو تو ضرور تھا۔ مگر شادی کے تین ہی چار مہینے کے بعد بیوی مر گئی تھی۔ کوئی بال بچہ بھی نہیں تھا حسب نسب، چال چلن، اور طور طریقے بھی ایسے تھے جن پر سارے گھر کو اطمینان تھا۔ مگر ان کی شرط بھی یہی تھی کہ پہلے لڑکی دیکھیں گے۔ ابّا جان نے ان سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ ہاں لڑکی دکھا دی جائیگی۔ لیکن اُمّی جان نے جو سُنا تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ وہ چیخم دھاڑ رونا دھونا کہ اللہ تیری پناہ ابّا جان کے پیچھے اس بُری طرح پانچے جھاڑ کر پڑیں کہ ان کی آئی گئی عقل جاتی رہی۔ گھر بھر میں دو دن تک یہی طوفان برپا رہا۔ چار پہر سارے گھر میں کسی کے مُنہ پر کھیل

تک نہ گئی۔ امّی جان کا رونا دیکھ دیکھ کر کلیجہ پھٹا جاتا۔ ان کی باتیں سن سن کر ہر گھڑا بیٹھا رونے لگتا۔ پورے دو دن ابا جان مردانے سے باہر نہیں نکلے بارے تیسرے دن جو آئے بھی تو امّی جان سے یہی کہا کہ بیگم اب میری عزت اور لاج تمھارے ہاتھ ہے اگر تم رکھو تو یہ رہے، ورنہ ناک تو کٹ ہی چکی جب میری بیوی نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ دنیا میں میرا ٹھکانا نہیں۔ دو دن سے میں اسی سوچ میں ہوں کہ کیا کیا جائے۔ ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی ہے اگر تمھیں پسند آئے تو مانو ورنہ جانے دو۔ میرے خیال میں تو بدرالنسا کو دکھا دیا جائے اس کا نکاح بھی ہو چکا ہے مہرالنسا کے دولھا کی محرم بھی ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ امّی جان اس پر بھی رضامند نہیں ہوئیں کہنے لگیں، یہ دھوکے فریب کی باتیں مجھے پسند نہیں............

...... مختصر یہ کہ کئی دن کی کدّ و کاوش کے بعد ابا جان کی تجویز منظور ہو گئی۔ اور تھانیدار صاحب کے گھر والوں کو اس کی اطلاع بھی دیدی گئی۔

ہفتہ عشرہ کے بعد ہی ان کے گھر کی عورتیں اور مرد آ گئے۔ امّی جان اور خالہ بی نے مجھے خوب بنا سنوار کر آپا کے انٹرویو میں پیش کر دیا۔ اور میں پسند بھی کر لی گئی، اسی دن تاریخ بھی مقرر ہو گئی اور یہ لوگ واپس چلے گئے۔

اب اس طرف کی سنیے! میری سسرال والوں نے رخصتی کے لئے تقاضا کیا۔ ابا جان اور امّی جان میں کئی دن کے مسلسل مشورہ اور صلاح کے بعد طے پایا کہ ان لوگوں کو لکھ دیا جائے کہ ایسے گرانی کے زمانہ میں دو کام ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہے تو دو چار مہینے کے بعد بدرالنسا کی رخصتی کر دی جائیگی۔ اس سلسلہ میں کئی ہفتے برابر ابا جان اور میری سسرال والوں میں خط و کتابت ہوتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ خفا ہو گئے اور صاف صاف لکھ بھیجا

کہ اب ہم لوگ کبھی رخصتی کرانے کیلئے نہیں آئیں گے۔ آپ کا جب جی چاہے لڑکی بھیج دیجئے گا۔ انہوں نے آپا کے بیاہ میں بھی آنے سے انکار کر دیا۔ یہاں آج کل اس قسم کے قصے تصفیے طے کرنے کی کس کو فرصت تھی۔ سارے گھر میں گہما گہمی سے آپا کا بیاہ رچا تھا۔ انتظامات ہو رہے تھے، دن رات سب کو اسی بیاہ کی فکر تھی۔ امّی جان نے تو جھنجھلا کر یہاں تک کہہ دیا۔ میری جوتی سے بیاہ میں نہ آئیں گے یہ لوگ تو کیا میری بیٹی کا بیاہ نہ ہوگا۔ جہاں مرغا نہ ہوگا وہاں کیا سویرا ہی نہ ہوگا۔ آج کل سارے گھر میں چرچے تھے کہ اللہ پلک جھپکتے ہی وہ گھڑی آجائے جب دکھیاری بہن کے سہرے کے پھول کھل جائیں۔ ماں باپ کے سایہ میں پروان چڑھے لڑکی۔ صدا سکھ سہاگ سے رہے پھلے پھولے سدا آباد رہے۔

خوشی اور مسرت کی گھڑیاں دوپہر ڈھلے کی چھاؤں ہوتی ہیں ادھر آنکھ بند کی ادھر شام ہو گئی۔ آپا کے بیاہ کی تاریخ بھی اسی طرح گھوڑے کی دوڑ دوڑتی ہوئی آگئی۔

بھیتر سے باہر تک عجب گہما گہمی کا عالم تھا، کان پڑی آواز سنائی نہ پڑتی جسے دیکھو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے ہے۔ وہ نفسی نفسی کہ الامان و الحفیظ۔ میراثنیں اور ڈومنیاں ایک طرف اپنی بیوقت کی راگنیاں اڑا رہی تھیں ٹولی ٹولی میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اپنی قسمت کا الگ رونا رو رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں دوسری طرف اپنی جوانی کے قصے دہرا رہی تھیں۔ باہر شہنائی، ارگن، ڈھول دھمامہ۔ ایک ہنگامہ تھا۔ ادھر آپا قیمتی شاہی جوڑا پہنے ہوئے دلھن بنی بیٹھی تھیں اور چاروں طرف ہمجولیوں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ سکھی سہیلیوں کیلئے یہ تماشہ بالکل نیا تھا۔ کہ ایک دولھا کیلئے دو دلھنیں تیار ہیں ہر طرف سے ہم دونوں پر چٹکیوں

کی ایسی بھرمار تھی کہ سارا بدن آبلہ ہو گیا تھا۔ شوخ و شریر لڑکیاں طرح طرح کے فقرے کس رہی تھیں۔ کوئی کہتا بھئی دیکھیں یہ میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے امیدوار تو دونوں اچھے ہیں کسی کا خیال تھا آپا تھانیداری بہت اچھی کرینگی۔ بعض کہتی تھیں تھانیداری کی وردی مجھ پر خوب پھبے گی۔

تھوڑی دیر میں بارات آنے کا شور اٹھا اور دروازے پر بارات آ گئی، لڑکیوں کی پوری فوج نے گلاب کی چھڑیوں سے داروغہ جی پر ایسا حملہ کیا کہ ساری تھانیداری بھول گئے۔ دوارے چار کی رسمیں ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد نکاح پڑھنے کے لئے قاضی آ گئے۔ عورتوں کے ایک جم غفیر نے ہم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایک بڑی بی نے قاضی جی کے آنیکے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا "بیٹی ہنکاری بھر دو" تمہاری ماں نے "ہوں" کی تھی، تمہاری دادی نے "ہوں" کی تھی۔ تمہاری نانی نے، تمہاری پھوپھی نے، تمہاری چچی نے، کہدو "ہوں" کہ بالعوض پچہتر ہزار دینار سرخ تم کو قبول و منظور ہے۔ "قبول ہے" آپا کا یہ حال کہ روتے روتے بے حال ہوئی جا رہی تھیں "ہوں" کہتا تو کون، کئی منٹ یہی ہوتا رہا۔ اتنے میں کسی شریر لڑکی نے ہنکاری بھر دی۔ مبارک سلامت کے غلغلے بلند ہونے لگے۔ خوشی کے شادیانوں سے سارا محلہ گونج اٹھا۔ یکایک جلدی سے خالہ بی نے آ کر آپا کو برابر کی کوٹھری میں کر دیا۔ مجھ سے چپکے سے کہا کہ سسرال والی آ رہی ہیں۔ ہوشیار رہنا۔ میں شروع ہی سے اپنا پارٹ اچھی طرح ادا کر رہی تھی۔ کچھ اور سر جھکا کر بیٹھ گئی اتنے میں آپا کی ساس، نندیں اور دیورانیاں آ گئیں۔ بڑی بی نے سہرا اٹھا کر میرے چاند سے مکھڑے کی چٹ پٹ بلائیں لیں۔ واری ہوئیں، صدقے گئیں اور ایک قیمتی انگوٹھی میرے ہاتھ میں پہنا دی۔ اُن کے ہٹتے ہی نندوں نے ہوحق شروع

کردی۔ کبھی گال میں چٹکی لے لی۔ کسی نے گدگدایا۔ کوئی گھنٹہ بھر یہی ہوتا رہا۔ یکایک دولھا کے اندر آنے کی دھوم مچ گئی۔ چھپنے والی عورتیں اور لڑکیاں کوٹھریوں اور کمروں میں چھپ گئیں۔ ڈیوڑھی کے دروازہ سے بہنوں نے دولھا کے سر پر آنچل ڈالا۔ اور جس کمرے میں میں بیٹھی ہوئی تھی وہاں لے آئیں۔ اُمّی جان نے دولھا کی بلائیں لیں اور دیر تک دعائیں دیتی رہیں۔ ایک عورت نے میرا گھونگھٹ اٹھا کر دولھا کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "کہو بیوی آنکھیں کھولو۔۔۔۔۔۔ میں تمھارا غلام" داروغہ جی بھی تھے بڑے چلتے ہوئے کہنے لگے "بیوی آنکھیں کھولو میں تمھارا گلاب" سب کھلکھلا کر ہنس پڑے میں نے کنکھیوں سے تھانیدار صاحب کو جو دیکھا تو مجھے گھور رہے تھے۔ آرسی مصحف کی رسم ادا ہونے کے بعد تھوڑی دیر تک کچھ اور رسمیں ہوتی رہیں۔ اور دولھا میاں باہر چلے گئے۔

دولھا کے باہر جاتے ہی رخصتی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ آپا کی ساس اور نندیں چاروں طرف سے مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک طرف کوٹھری میں آپا کو رخصتی کے لئے سنوارا جا رہا تھا۔ تو باہر دکھانے کیلئے میں بھی سنواری جا رہی تھی۔ ابھی دلھن کا بناؤ سنگھار ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ باہر سے آوازیں آنے لگیں۔ گاڑی کا وقت جا رہا ہے جلدی کیجئے دیر ہو رہی ہے۔ آپا کی ساس اور نندیں باڈی گارڈ کے دستے کی طرح چاروں طرف جمی ہوئی تھیں اور دلھن کی رخصتی کا وقت قریب تھا۔ یہ وقت نہایت ہی نازک تھا۔ اُمّی جان اور خالہ بی گھبرائی ہوئی تھیں اور کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح کچھ دیر کے لئے رخصتی ٹل جائے۔ کسی تدبیر سے دلہن بدل دی جائے۔ ادھر آپا کے سسرال والے تھے کہ بری طرح مجھ سے چمٹے تھے۔ میرا برا حال تھا کہ یا اللہ اب کیا ہوگا۔ دل میں پنکھے سے لگ رہے تھے ــــــــ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب

کی عقلیں جواب دے چکی تھیں، سب ہواس باختہ نظر آرہے تھے۔

دُلھن کی رخصتی کے وقت یوں تو عام طور پر رونا دھونا ہوتا ہی ہے لیکن یہاں عجیب عالم تھا۔ رونا تھا اور قیامت کا رونا۔ حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ تک رہا تھا۔ کئی بار ابّا جان نے ڈیوڑھی میں آکر بات چیت کی لیکن سب بے سُود۔ پالکی لگ چکی تھی۔ روئی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہا جا رہا تھا۔ میں آپا کی ساس نندوں کے مجمع میں خود آپا کے بجائے سسرال رخصت ہو رہی تھی اور سب دم بخود تھے۔ گویا یہی وہ وقت تھا کہ :۔

"جہاں بات بنائے نہ بنے"

نوکر نہیں ملتے

"میں نے کہا کیا موئے یہ سب نوکر بھی لڑائی پر بھیج دیئے گئے......؟"
میرے منہ میں دبی ہوئی حقہ کی نہال چھوٹ گئی یکایک! بیگم ہی تھیں شاید ریڈیو کیلئے کسی "ٹاک" کی "ریہرسل" کر رہی تھیں ——!

"موئی یہ لڑائی نہ ہوئی عذاب جان ہوگئی جس شے کو پوچھئے مہنگی ہے لڑائی کی وجہ سے!! اے موئی اس "چوہیٹی" کی کون سی بساط۔ ایک پیسہ میں اتنی مل جاتی تھی کہ سات سات آٹھ آٹھ جمعراتوں کے لئے کافی! اب وہ بھی ایک آنہ کی پڑیہ۔ میں کہتی ہوں کہ کیا یہ بھی لڑائی پر جاتی ہے! اللہ تیری پناہ زندگی اجیرن ہوگئی ہو......زندگی ——!

میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں آپ! آپ ہی سے کہہ رہی ہوں!
بیگم کا روئے سخن ایکدم سے "ڈائرکٹ" ہوگیا میری طرف!
آپ کو تو کسی بات کی فکر ہی نہیں —— وہ جو شیخانی ہیں آپ کی......چہیتی —— دولاری! جواب دے رہی ہیں کہ ہوی اس نگوڑ ماری بیساکھ میں مجھ سے چولھا ہانڈی نہ ہوسکیگا۔ ایک نواں کا دل اسی دن —— اچاٹ ہے جب سے میں نے رمضانی کو نکال دیا۔ جس پر بی شیخانی کو بڑھس لگا تھا —— اور اب تو گویا ایک بہنہ

والی بات ہی ہے کہ گرمیوں میں ان سے باورچی خانے کا کام سنبھل نہیں سکتا۔ پھر ایمان کی بات یہ ہے کہ ـــــ شیخانی کا پیٹ پیچھا ہے وہ بہت سی جوانوں سے بڑھ کر ہی کام کرتی ہیں۔ سارے گھر کا کھانا دانہ آئے گئے کی خاطر مدارات، بچوں کی دیکھ بھال، سبھی کچھ تو ان کے سر ہے اور وہ بیچاری اُف نہیں کرتیں ـــــ اور ـــــ اور ـــــ آپ ہیں کہ کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ جب آدمی کیلئے کہتی ہوں آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب ہے کہ لڑائی کی وجہ سے نوکر نہیں ملتے۔ ایہ بالکل انوکھی بات ہے کیا نوکر بھی لڑائی پر بھیجد یئے جاتے ہیں؟ اصل تو یہ ہے کہ آپ کو کچھ فکر ہی نہیں! ڈھونڈھنے سے تو خدا بھی ملجاتا ہے نوکر تو نوکر!"

میں سر کھجا کر سوچنے لگا آخر یہ بیگم اسوقت کہنا کیا چاہتی تھیں ـــــ لیکن جانتا تھا کہ ان سے بحث کرنا فضول، بیکار، بے سود، آخر ہیں تو وہ بھی وہی عورت ذات! جسکو دنیا ناقص العقل سمجھ چکی ہے۔ اب رہا نوکر کا سوال تو یہ کہنا کہ ڈھونڈھنے سے خدا مل جاتا ہے ـــــ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس لڑائی کے زمانہ میں ممکن ہے بہت تلاش و جستجو کے بعد کہیں خدا مل جائے لیکن نوکر نہیں ملتے۔ میں نے کیا کیا کوششیں نہیں کیں ـــــ مگر خاک نوکر نہ ملا۔ بی، اے، ایم، اے کی ڈگریاں لٹکائے ہوئے کتنے نوجوان بیکار گھومتے ہیں لیکن ان کے دماغوں میں سوائے آئی۔ سی۔ ایس۔ پی۔ سی۔ ایس۔ کنگس کمیشن اور وائیسرائے کمیشن کے کوئی دوسری چیز ہی نہیں، چہ جائیکہ خدمتگاری۔ پھر سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی کہ شیخانی کی وجہ سے نوکروں کو ٹھہرنا مشکل ہوتا تھا کیونکہ وہ اس قدر ضرورت سے زیادہ "عاشق مزاج" واقع ہوئی تھیں کہ ادھر نوکر آیا ـــــ ادھر انہوں نے پیام و سلام شروع کر دیئے اپنے نکاح کیلئے ـــــ! اب آپ ہی غور فرمائیے کہ نوکر ٹھہرے تو کیسے! اس پر طرہ یہ کہ بقول بیگم کے شیخانی

میری چہیتی اور دُلاری تھیں۔!

ببیں تفاوت راست کجا ست تا بہ کجا!

دفتر سے واپسی کے بعد اب یہی ہونے لگا ——— کہ کم از کم روزانہ میں نوکر کی تلاش میں چکر لگاتا! احباب اور ملنے والے بھی عاجز تھے کہ میرے پاس سوائے نوکر کے اور کوئی دوسرا موضوع باقی نہ رہ گیا تھا!

" بھائی ظہور اگر تمھاری طرف کوئی نوکر ہو تو اطلاع دینا "

" اجی مولانا ——— آپ سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک نوکر ہی دلوا دیں "!

" بھائی صاحب خیال رکھیئے گا، مجھے نوکر کے بغیر سخت تکلیف ہے "

" تنخواہ جو فرمایئے گا دیدی جائیگی لیکن نوکر جلد ملجائے بہت جلد "!

" جہاں تک بڈھا آدمی ہو اچھا ہے "

حقیقت میں مَیں گھبراتا تھا کہ اگر کوئی جوان آدمی آگیا تو شیخانی کا بوڑھا مگر پُر شباب دل کسی طرح روکے نہ رک سکے گا۔ اور ہمارا گھر اچھا خاصا " وادیٔ نجد " بن جائیگا۔ غور تو فرمایئے کہ شیخانی کی عمر پچاس سے کچھ اوپر پہونچ چکی تھی اور صورت و شکل تو بس ——— کچھ پوچھئے نہیں۔ یعنی ان میں عورت ہونے کے کوئی آثار قدیمہ باقی نہ رہے تھے۔ بجز اس کے کہ ان کے سینہ میں بالکل بائیں طرف جہاں پر یہ ڈاکٹر لوگ استھسکوپ لگا کر دیکھتے ہیں ——— ایک دل ضرور تھا اور وہ بھی نہایت ذوق طلب نوجوانی کے خیال میں ڈوبا ہوا ——— اور بس؟ لیکن ہم لوگوں کے سامنے سب سے بڑی دشواری اور مجبوری جو تھی وہ یہ کہ ہمارے اور بیگم کے مشترکہ بچوں کی وہ کھلائی رہ چکی تھیں۔ حالانکہ بیگم کے نزدیک شیخانی کے ان تمام احسانات کا بار تنہا میری ہی گردن پر تھا

دوستوں اور ملنے والوں کی کوششوں سے دو چار نوکروں کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا وہ حقیقتاً ایسے شرائط تھے کہ میں اپنی بیگم کو طلاق دیکر اور نصف درجن کے قریب بچوں کو عاق کر کے بھی ان " شرکار حیات " کو حاصل نہیں کر سکتا تھا جن کے نزدیک میری تمام تنخواہ معہ گرانی الاؤنس کے ان کی ضروریاتِ زندگی کیلئے ناکافی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک معمولی تنخواہ کا آدمی کسی طرح اتنا بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

ادھر اپنی حالت یہ تھی کہ گھر میں گھستے ہی بیگم " نوکر نامہ " چھیڑ دیتیں۔ اُدھر دوست احباب کے نزدیک مجھے سخت قسم کا مراق ہو گیا تھا — پھر سب سے زیادہ شینخانی کے نوٹس —!

" میاں جلدی انتظام کیجئے نوکر کا — ورنہ !.................؟

" باورچی خانے جاتے ہی میرا سر پھٹنے لگتا ہے "

" بیوی یہ دس دس کام مجھ سے نہ ہو سکیں گے کہ بچوں کو بھی سنبھالوں اور چولہا ہانڈی بھی کروں۔

" اگر دنیا بھر سے نوکر اڑ جاتے تو ساری دنیا کا کام کیسے چلتا "...........

..........." میاں کو کچھ فکر ہی نہیں۔" !

" بیٹھے بٹھلائے رمضانی کو نکالدیا بیچارے کو — چہ چہ.......!

شینخانی ٹھنڈی سانس بھرنے لگتیں ! گویا کہ : " زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا "

کئی بار میں نے سوچا کہ کہدوں شینخانی سے کہ بھئی اگر مجھے فکر نہیں ہے تو تمہیں کسی کو ٹھے کر لو۔ لیکن ڈرتا تھا تو اس بات سے کہ شینخانی — زخمِ دل ابھی آرے ہیں رمضانی کا غمِ فراق ابھی تازہ ہے فوراً ہی نہ کہدینگی کہ رمضانی کو کیوں نہیں رکھ لیتے —

میاں آپ! اور یہ مجھے کسی طرح پر منظور نہ تھا۔

جو کچھ بھی ہو مگر غنیمت تو یہی ہے کہ یہ مولانا لوگ جہاں ایک طرف خدا ڈھونڈ لیتے ہیں ——— تو دوسری طرف کنواریوں کیلئے بیویاں ——— بے نوکروں کیلئے نوکر ——— اور بیواؤں کیلئے شوہر ڈھونڈھنے میں بھی کافی مشاق ہوتے ہیں چنانچہ اس ایسے نازک موقعہ پر جبکہ دو ہی چار دن میں شیخانی ہم لوگوں کو داغِ مفارقت دینے والی تھیں۔ مولانا جانے کہاں سے ایک نوکر ڈھونڈھ ہی لائے۔ نوکر کیا! اچھا خاصا رنگروٹ ہٹا کٹا موٹا تازہ نوجوان جسکو دیکھ کر شیخانی تو شیخانی اچھے خاصے صبر آزما دل پھسل جاتے! اور پھر تنخواہ بھی معمولی! ظاہر ہے کہ شیخانی کی طرف سے بالکل اطمینان نہ تھا مگر ایسے نازک وقت میں اس سے اچھا نوکر ملتا بھی تو نہیں تھا؟ مولانا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے ماں باپ کوئی نہیں ہیں اور حال ہی میں مشرف بہ اسلام کیا ہے مولانا نے اسے! میرے لئے اس سے زیادہ کیا نعمت ہو سکتی تھی کہ اس کے نہ گھر نہ بار نہ بیوی نہ بچے! یہ بھی خطرہ نہیں کہ کہیں بھاگ جائیگا۔

بیگم کو جب میں یہ خوشخبری سنا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کی آڑ میں شیخانی بھی موجود تھیں! اس کا حلیہ، عمر اور کمسنی کا حال سنکر اُن کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور ان کو پھر پریاں آنے لگیں ——— میرے نظر پڑتے ہی حسبِ معمول شرما کر شیخانی نے دوپٹہ سے اپنا جھریوں دار چہرہ چھپا لیا ———!

دوسرے ہی دن مولانا اسے لیکر پہونچ گئے۔ معلوم ہوا کہ اس کا اسلامی نام غلام محمد رکھا ہے مولانا نے ——— رسمِ تعارف کے بعد ہم نے بیگم اور اپنی طرف سے مولانا کا شکریہ اتنے شاندار الفاظ میں ادا کر دیا کہ مولانا کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اور ان کی داڑھی ہوا میں لہرانے لگی۔! بیگم نے اس سلسلہ میں مولانا کو ایک چائے بھیجی اور مٹھائی ——— یہ

تو گویا ان کا حق ہی تھا۔

"غلام محمد" کو ضروری کاموں کی تفصیل جب بتلائی گئی تو معلوم ہوا کہ کھانا پکانا کچھ بھی نہیں جانتا ——— مگر نہ ہی شیخانی جو کل تک باورچی خانے میں جاتے ہی دردِ سر میں مبتلا ہو جاتی تھیں ——— آج اس پر تیار تھیں کہ "غلامی" اوپر دری کا کام کر لیا کرے اور باورچی خانہ یہ خود سنبھال لینگی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ شیخانی نے یہ بھی وعدہ لے لیا کہ وہ "غلامی" کو کھانا پکانا ضرور سکھائیگی تاکہ .... تھوڑے ہی دنوں میں وہ کھانے پکانے سے بخوبی واقف ہو جائے!

مختصر یہ کہ یہ تمام شرائط بیگم کی صدارت میں شیخانی اور غلامی کی مشترکہ کانفرنس نے منظور کر لئے۔ امیرے کاندھوں کا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ——— اور آئے دن بیگم کے طعنے، دوستوں کا تمسخر، شیخانی کے نوٹس خدا خدا کر کے ختم ہو گئے۔

"غلامی" کے متعلق مولانا نے جتنا سدر کہا تھا اس سے کہیں کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ شروع شروع میں ہفتہ دو ہفتہ تک تو اسے "وحشت" ضرور رہی۔ مگر رفتہ رفتہ ہم لوگوں میں مل جل کر یہ اجنبیت بالکل دور ہو گئی۔ "شیخانی" بھی آ رمضانی کے غمِ فراق سے آزاد ہو چکی تھیں۔ اور غلامی کی سکون بخش جوانی ان کیلئے ایک ایسا سرمدی پیام ثابت ہو رہی تھی۔ کہ "باورچی خانے" کے جہنمی ماحول سے اب ان کا دل بالکل نہیں گھبراتا۔ بلکہ جب تک وہ غلامی سے کوئی نہ کوئی کام لیتی رہتیں ان کے استقلال و انہماک میں ایک طرح سے سکون ہی نظر آتا ——— اور ادھر کسی نے غلامی کو آواز دی کہ یہ بگڑ گئیں ——— "تو پھر یہ کام ہو چکا ——— یا تو آپ لوگ اپنا ہی کام لے لیں غلامی سے! یا یہ کھانا ہی پکانا سیکھ لے! شیخانی کے غمزے سارے

گھر کو اٹھانا پڑتے اسی لئے کہ اگر وہ ناراض ہو کر چلی گئیں تو نہ محض اتنا شفیق نوکر نہ ملے گا بلکہ ان آدھے درجن کے قریب بچوں میں سے ضرور کوئی نہ کوئی ہُڑک کر جان دیدے گا۔ ان کے پیچھے ــــ!

غلامی بھی شیخانی کی شفقتوں کے دن بدن گرویدہ ہوتے جا رہے تھے۔ کبھی ہانڈی میں سے بھونا بھونا گوشت نکالکر نمک چکھایا جاتا تو انہیں غلامی کو ــــ اصلی دیسی گھی ڈالا جاتا تو غلامی کی پلیٹ میں۔ ناشتہ کیلئے پکی ہوئی پوریاں پہلے ہی سے نکال لی جاتیں تو انہیں کیلئے۔ رمضانی کی خاطر و مدارات بھی ہوتی تھی۔ لیکن غلامی نے اس بُری طرح شیخانی کے دل کو گھائل کر دیا تھا کہ رمضانی سے زیادہ ان کی خاطریں ہونے لگیں۔!
بیگم اپنی آنکھوں سے اپنا گھر اُجڑتے دیکھ رہی تھیں ــــ مگر لب نہ ہلا سکتیں! تھوڑے بہت واقعات میری نگاہوں کے نیچے بھی آجاتے لیکن میں بھی چپ تھا کیونکہ گھر کی انچارج تنہا بیگم تھیں۔ دوسرے اگر میں ان معاملات میں دخل دیتا تو اس کے معنی یہ تھے کہ بہت جلد مجھے دوسرے نوکر کی تلاش شروع کر دینا پڑتی۔! تھوڑے ہی دنوں میں شیخانی نے اپنے غلامی کو اچھی طرح پھانس لیا تھا اور ہم لوگ اپنی نگاہوں سے وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جو نہ دیکھنا چاہیئے تھا ہم لوگوں کو لیکن سوائے صبر کے چارہ ہی کیا تھا! کبھی کبھار جب بیگم کو غصہ آجاتا تو اس خوف سے کہ مجھے دوسرا نوکر نہ تلاش کرنا پڑے! میں ان کو سمجھا بجھا کر خاموش کر دیتا ــــ!

لوگ کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مگر میرا تجربہ اس کے بالکل خلاف تھا۔ ہم لوگوں کی خاموشی اور چشم پوشی دن بدن خطرناک سے خطرناک صورت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ اور شیخانی کا جذبۂ عشق نہایت زوروں پر بھڑک اٹھا تھا ــــ یہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ گھر کے کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال میں بھی فرق آنے لگا ــــ

ظاہر تھا کہ بیگم ہی کیلئے نہیں بلکہ خود میرے لئے یہ صورت ناقابل برداشت تھی۔ مگر سوال تھا تو یہی کہ نوکر نہیں ملتے! گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل والا مضمون تھا۔

ابھی دو چار ہی مہینے ہوئے تھے کہ غلامی پھر۔ غلام محمد۔ ہوگئے! پاؤں میں دس آنے والا باٹا" دھاری دار قمیص، کنٹوپ کی مارکین کا پاجامہ! شیخانی نے پیسہ پیسہ جوڑ کر جو کچھ بھی جمع کیا تھا! غلام محمد پر صرف ہونے لگا۔ ورنہ خود ان کی آمدنی ظاہر تھی! خشخشے بالوں کی بجائے اب غلام محمد نے انگریزی بال رکھ کر باقاعدہ طور پر ان میں تیل ڈالنا اور کنگھی کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ بیڑی کا بنڈل تو ہر وقت جیب ہی میں رہتا۔ ادھر شیخانی بھی نک سکھ سے بجنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دن میں کئی کئی بار مُنہ دھونا، کنگھی کرنا باقاعدہ دانت مانجھنا۔ سبھی کچھ شروع ہو گیا تھا۔ یوں سُرمہ تو روز ہی لگاتی تھیں اب بیگم کیلئے یہ مناظر قریب قریب ناقابلِ برداشت ہو چکے تھے۔ لیکن میرے سمجھانے بجھانے سے خاموش تھیں اور میں ڈر رہا تھا کہ اگر شیخانی چلی گئیں ان آدھے درجن کے قریب یتیموں کا کیا حال ہو گا۔ دوسرے پھر دہی نوکر کا سوال بجائے خود ایک میری حیبت سے کم نہ تھا۔

اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کی یتیمی کا داغ ممکن ہے کہ قابل دید نی ہو سکتا۔ لیکن بیگم کے طعنے! دوستوں کا مضحکہ۔ ایک کوفت ایسی نہیں تھی جس کو آسانی کے ساتھ برداشت کر لینے پر میں تیار ہو جاتا۔ شیخانی کو سمجھانے کے معنی بھی یہی ہوتے کہ بیٹھے بٹھائے آگ پر تیل چھڑک دیا جائے! غلامی کو نصیحت کرنا بھی گویا شیخانی کے جذبہ عشق کو ایک قسم کا الٹی میٹم ہی دینا تھا۔ غرضیکہ ہم لوگ بُری طرح شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ اور ابھی اس مسئلہ پر غور ہی کر رہے

تھے کہ کیوں نہ غلامی کو جواب دیدیا جائے۔ شاید سی طرح شیخانی کی محبت میں کوئی ٹھہراؤ پیدا ہو سکے کیونکہ رمضانی کے ہٹا دینے پر رفتہ رفتہ شیخانی کا جذبۂ محبت خود بخود سرد پڑ گیا۔ کیونکہ بہت دنوں تک اس رمضانی کے فراق میں اس حد تک بیحال تھیں کہ مرنے جینے کا ہوش باقی نہ تھا —— پھر آخر صبر آہی گیا ——!

ہم اور بیگم ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ ایک شام کو —— یعنی جمعہ کی شام کو! شیخانی معہ اپنے نورِ نظر غلامی کے غایب ہوگئیں میرے بچوں کو سڑ کتا چھوڑ کر —— جیسے گئیں۔ بیگم نے چولھے کا منہ پھونکا بچوں نے تمام رات بُری طرح رو رو کر گذاری ——!

سویرا ہوا تو شیخانی آمیں دلھن بنی ہوئیں۔ شاہانہ جوڑا پہنے کچھ لجائی۔ کچھ شرمائی —— معلوم ہوا کہ رات کو غلام محمد صاحب سے عقد فرمالیا ہے! آپ حساب لینے کیلئے تشریف لائی ہیں —— بیچارے بچے کیا سمجھتے کہ ایک شب کی بیاہی دُلھن ان کی ماں نہیں بن سکتی۔! چاروں طرف سے چمٹ گئے، مارے غصّے کے بیگم کا بُرا حال تھا —— لیکن میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ " نوکر تو کہیں ملتے نہیں ——!"

"یہ ریڈیو والے"

ہا......... ئے! رسولن نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ـــ "! آج تو اُس بنّو کی بچّی نے غضب ہی کر دیا ـــ اب میں کیا کہوں آپ سے۔

"کیا ہوا خیر تو ہے رسولن" بیگم کی انگلیاں سروتہ کی گرفت پر جم کر رہ گیئں۔!

بس کچھ نہ پوچھیے بیگم ساب! رسولن کی سانس تیز ہوتے ہوئے سینے میں پھڑپھڑانے لگی۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ہائے یہ حرام زادی بنّو کی بچّی ـــ خدا غارت کرے موئی کو ـــ اللہ سمجھے رنڈی ـــ کسبن ـــ بیسوا ......! آخر ہوا کیا! بیگم نے پوچھا ـــ ؟ کیا کیا بنّو نے!

کیا کیا ـــ بیگم صاحب! رسولن بولی ـــ اگر میں آپ سے بیان کر دوں ـــ تو آپ مجھ کہنے والی کو ابھی زندہ جان چنوا دیں! اور اس نصیبوں پیٹی کا تو کہیں بھی ٹھکانا نہ رہے ـــ!

سنا رسولن۔ بیگم کو تاؤ آ گیا۔ مجھے تیری یہ گول مول باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اگر کہنے والی بات نہیں تھی تو میرے سامنے ذکر ہی کیوں کیا ـــ اور جب ذکر کیا تو پوری بات بتانا پڑے گی مجھے! ورنہ ـــ جانتی ہے میں بُری طرح پیش آؤں گی۔

جی ـــ بیگم ساب! آپ کے اسی غصہ سے تو میرا دم نکلتا ہے۔ رسولن نے

کانپتے ہوئے کہا اور روتی صورت بنادی۔

بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔ میں کہتی ہوں آخر ہے کیا ؟ پوری بات کیوں نہیں کہتی۔ بیان کر میں خفا نہ ہوں گی۔ ؟

"آپ کو اللہ کی قسم ۔ رسولن نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ چھوٹے میاں سے نہ کہیئے گا ورنہ میرے سر میں ایک بال بھی باقی نہ رہے گا ــــ اور ــــ اور ــــ ان کی کوئی خطا نہ ہوگی ــــ یہ جو بنّو حرامزادی ہے خود ہی ....!

چپ کیوں ہو رہی پوری بات کیوں نہیں بتاتی آخر!

بیگم رسولن سے کچھ اور قریب ہوگئیں۔

"حضرت بی بی کی مار پڑے مجھ پر جو جھوٹ کہتی ہوں آپ سے! رسولن نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا آج جب میں بڑے کمرے کے حمام سے میلے کپڑے اٹھانے گئی .... تو (رسولن کی زبان لڑکھڑانے لگی) .... تو یہ ہوا ...... کمرے کے دروازے بند تھے .... اور ــــ وہ جو صوفہ بچھا ہوا ہے مسہری کے پاس اس پر چھوٹے میاں لیٹے ہوئے تھے! زمین پر ...... یہ حرامزادی بنّو بیٹھی ...... آپ ہی سے گئی تھی ــــ چھوٹے میاں نے چڑیل کو بلایا بھی نہ ہوگا۔ میں سچ کہتی ہوں اس میں چھوٹے میاں کی کوئی غلطی نہیں تھی ــــ یہ خود ان کے پاس گئی ہوگی۔"

"ہاں پھر کیا ہوا رسولن (بیگم نے رازدارانہ انداز سے پوچھا) اور کیا دیکھا۔"

"اور کچھ نہیں ــــ چھوٹے میاں نے کچھ نہیں کیا۔ ان کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ رسولن برابر چھوٹے میاں کی صفائی دے رہی تھیں۔ اس ماں زادی۔ بیسوا نے خود ان کے زانو پر سر رکھ دیا ہوگا ــــ اور پھر تو وہ مرد تھے! کہنے لگی قطامہ۔ حرامزادی کہ آپ مجھ سے بیاہ کرلیں، وہ بالکل رضامند نہیں ہوئے ــــ بس میں نے اتنا ہی دیکھا۔ اللہ میری توبہ!

اب تک جب یاد کرتی ہوں پسینے میں شرابور ہو جاتی ہوں (رسولن کی سانس پھولنے لگی)

— بیگم صاحب میری لاج آپ ہی کے ہاتھ ہے! اب اگر سن لیا چھوٹے میاں نے —!

مار ہی ڈالیں گے مجھے —!

بیگم پر کچھ دیر کیلئے سکتہ سا ہو گیا۔!

یہ حرامزادی بنّو کی بچّی — میں تو پہلے ہی سے کھٹکی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور دال میں

کالا ہے — اس کے طور طریقے اللہ جانتا ہے رسولن مجھے کبھی ایک آنکھ نہ بھائے۔

— اللہ۔ میری رسولن۔ سچ کہنا...... کبھی اور کچھ بھی دیکھا — بیگم نے مزید تحقیقات

شروع کر دی۔

آپ کے قدموں کی قسم۔ رسولن بولی۔ اس سے پہلے میں نے چھوٹے میاں کو

کبھی نہیں دیکھا — اور کچھ نہیں دیکھا — وہ تو بیچارے بڑے سیدھے ہیں —

اور یہ میری سوت بنّو — یہ تو بچپن ہی سے ایسی ہے!

کیسی ہے! بیگم نے پوچھا

"ارے یہی بنّو، جب کنواری تھی! اس سور کے بچے رحمت سے اس کا میل!

جنّو پر یہ جان دیتی تھی جو منجھلے میاں کے پاس نوکر تھا بھاگ گیا — سبھی جانتے ہیں —

بڑا بدماش تھا۔ کم بخت —! رسولن نے بنّو کی گناہگار زندگی کی ساری داستان کہہ ڈالی

دو لفظوں میں۔

میں کہتی ہوں! بیگم آہستہ سے پوچھنے لگیں! "ان" کے متعلق تو نے کبھی اور

کچھ سنا —!

"چھوٹے میاں"! میری گور میں کیڑے پڑیں بیگم صاحب! اگر آپ سے جھوٹ

بولوں میں نے کبھی نہیں سنا! رسولن نے کہنا شروع کیا! ویسے تو مرد ہیں! رات برات

اکثر ان کے دوست احباب جمع ہو جاتے ہیں تو میں نے خود دیکھا ہے کوئی نہ کوئی عورت زور زور سے گاتی ہے بولتی ہے!! اور کچھ نہیں دیکھا کبھی ـــــ!

کیا باتیں ہوتی ہیں ـــــ بیگم بولیں!

"وہ باتیں! رسولن نے جواب دیا ـــــ اب نہیں بیاہ سے پہلے جب سب لوگ جمع ہوتے تھے تب ہوتی تھیں! میری توبہ ـــــ ایسی باتیں ہوتی تھیں ـــــ اللہ میری توبہ (رسولن اپنے گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے لگانے لگی۔ کچھ نہ پوچھیئے بیگم صاحب!"

اتنے میں سامنے سے چھوٹے میاں آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ رسولن جلدی سے باہر چلی گئی اور وہ کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

شام کے سات بجتے ہی چھوٹے میاں کے کمرے میں اچھا خاصا مجمع لگ جاتا بیگم معہ اپنے پاندان کے! رسولن۔ صابرہ منّو۔ اور جنّت اس طرح ریڈیو کو گھیر کر بیٹھ جاتیں جیسے سینما کے پردے پر تماشائی نگاہیں جما لیتے ہیں۔ چھوٹے میاں نے سوئچ دبایا کہ فرمائشوں کا سلسلہ اس طرح شروع ہو گیا جیسے کسی گانے کی محفل میں فن جاننے والے تماشبین فرمائش کرتے ہیں۔

"وہ ـــــ دادرا ـــــ تو آپ کو یاد نہیں ہے ـــــ آئے ـــــ آئے ساجن...!

"بائی جی ـــــ وہ غالب کی غزل شروع کیجئے جس کا بول ہے

"تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی"

"سینہ پر بجا" یا نسیم کا گایا ہوا کوئی گیت تو آپ کو یاد نہ ہو گا ـ"!

"اجی صاحب بند کیجئے شاعرہ ـــــ کوئی پھڑکتی ہوئی چیز سنایئے۔

"استاد جی ـــــ میں نے کہا کوئی بھجن عنایت ہو بھجن ـ!

"ارے بھئی یہ ناچنا نہیں جانتیں ——— بالکل ....؟

"وقت کی چیز شروع کر دو ———"

چھوٹے میاں کے کمرے کا بھی یہی حال تھا گویا ———!

بیگم کا حکم تھا ———!

دلی لگایئے ——— قوالی سننے کو جی چاہتا ہے ———!

رسولن کی فرمائش!

میرے میاں ——— اللہ وہی بجایئے نا ——— "موا نیہر چھوٹا جائے"!

جنت کیوں خاموش رہتی۔

چھوٹے میاں آپ کے ہاتھ جوڑیں۔ وہی سنا دیجئے ——— "شیام کی مرلیا" باجے!

بنو نے اس جھشمک کے باوجود رسولن کو مخاطب بنا لیا۔

رسولن باجی ——— میری .... وہ بجواؤ ——— ! جمنا کنارے آؤ ساجن!

صابرہ بھی پانچویں سواروں میں تھی۔

بیگم صاحب! مجھے تو پنجابی گانا بڑا اچھا لگتا ہے ———!

اور بیچارے چھوٹے میاں کی جان سخت عذاب میں تھی! کیونکہ یہ کمبخت ریڈیو والے اپنی ہی گائے جاتے ہیں کسی کی سنتے ہی نہیں! پھر خبروں کا معاملہ۔ اس لڑائی کے زمانہ میں کون ایسا ہوگا جو ریڈیو رکھکر بھی خبریں نہ سُنے! ظاہر ہے کہ چھوٹے میاں کس طرح اس قیمتی وقت کو برباد کر دیتے! ریڈیو کی سوئیاں چاروں طرف نمبروں پر گھوم گھوم کر آ یہ دلی ہے یہ ہم لکھنؤ سے بول رہے ہیں " لاہور، پشاور، حیدرآباد کے راگ الاپ رہی تھیں۔ اور فرمائشوں کے مسلسل اختلافات کسی جگہ پر دم نہ لینے دیتے! ان کی جان عجب

مصیبت میں بھی نہ ریڈیوا پنے قابو کی چیز، نہ یہ عورتیں اپنے بس کی۔ سچ پوچھئے جس کی جان کو جنجال نہ ہو وہ بیٹھے بٹھلائے ریڈیو خرید لے! پھر کیا ہے! محلہ والے، شہر والے دوست احباب، عزیز اقربا، سبھی چراغ جلے سے موجود —— اور اگر جان بچانے کیلئے گھر کے کسی کونے میں رکھ دیجئے تو —— بیگم کا حکم، رسولن کی فرمائش! بہو کی خواہش غرضکہ ہر طرح پر مصیبت! گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ——! چھوٹے میاں کیلئے بھی یہی جھگڑے تھے جن سے گھبرا کر وہ گگڑوں کو کاڈربہ ہی پھونک دینا چاہتے تھے ۔ مگر چاردن کی بیاہی ہوئی دلہن کا خیال مجبور کر دیتا ان کو ——!

گھوڑا —— بیلچ —— ندی کی باڑھ —— اور عورت کی بدگمانی! اس تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے جیسے طوفان میں! جس گھر میں بدگمانی کی آگ لگ جاتی ہے —— وہاں بجھانے والوں کے پانی سے بھرے گاگر —— سرسوں کا تیل بن جاتے ہیں۔ نیک صلاح دینے والوں کی فیصلہ کن باتوں سے طرفداری کی بو آنے لگتی ہے! چھوٹے میاں کے گھر کا بھی یہی حال تھا چاردن کی بیاہی دلھن! امنگوں بھری راتیں، شباب اور محبت کے لاشعوری نغموں سے دور —— رسولن کے بیان کئے ہوئے دل دکھانے والے واقعات پر کروٹیں بدل بدلکر آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دیتی!

رسولن قسم، کی عورتوں کو مشرقی تہذیب و تمدن کے گھرانوں میں بڑا ہی ممتاز درجہ حاصل ہوتا۔ جیسی خلقت رسولن کی تھی دراصل "لڑاؤ اور حکومت کرو" کا فلسفہ اس طبقے سے بہتر آج تک نہ کوئی سلطنت سمجھ سکی نہ حکومت! یہی وجہ تھی کہ رسولن نے آگے دن کی ریشہ دوانیوں سے اس گھر میں اچھا خاصا وقار قایم کر لیا تھا ——

بنو ایسی منہ چڑھی خادمہ رسولن کی تدبیروں سے اس طرح الگ کر دی گئی۔

جیسے دودھ کی مکھی ۔ اور ـــــ جنت، صابرہ، گلشن یہ سب تو ابھی چھوکریاں تھیں ـــــ کمسن چھوکریاں ـــــ ان کی بہار کا زمانہ ابھی بہت دور تھا ـــــ رسولن کی ایسی گرگ باراں دیدہ ان ٹہنیوں کو بار آور ہونے سے پہلے قطع کر دیگی ۔

چھوٹے میاں گھر کی حالت کا خوب اندازہ لگا چکے تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی کھائی ہوئی قسموں کا اعتبار بیگم کی نگاہوں سے اُٹھ چکا ہے ۔ اس معاملے میں سمجھانا بجھانا محض فضول و بیکار ہے ۔ ! الھڑ اور نا سمجھ لڑکی آخر کسی نہ کسی دن سمجھ ہی جائیگی ـــــ بہت زیادہ صفائی دینے سے بعض وقت جرم کی اہمیت سنگین سے سنگین تر ہو جایا کرتی ہے ۔ اس لئے وہ بالکل خاموش تھے ۔ ریڈیو بھی بجتا تو تنہائی میں ـــــ کمرہ بند کر کے ۔ دوستوں میں آنا جانا بھی کم ہو گیا ۔ اور بیگم تو گویا بالکل ہی ـــــ ناراض تھیں ۔

اِدھر رسولن کے بڑھاوے چڑھاوے دن دونے رات چوگنے ہو رہے تھے ۔ رسد کی کوٹھری کی انچارج وہ ـــــ باورچی خانے کا انتظام ان کے سپرد ـــــ گھر کے تمام چھوٹے بڑے خرچے ان کے ہاتھ میں ـــــ بنّو ـــــ صابرہ ـــــ اور جنت پر حکومت ان کی ـــــ بیگم ایک معزول بادشاہ کی طرح رسولن کے اشاروں پر ناچ رہی تھیں ـــــ کیونکہ رسولن نے بیگم کو یقین دلا دیا تھا کہ عنقریب وہ چھوٹے میاں کی ناپاک اور گناہ آلود زندگی کا تاریک پہلو خود بیگم کو دکھا دیگی ـــــ اور بیگم اسی امید پر جی رہی تھیں کہ بہت جلد وہ اپنے شوہر کی نگاہیں اپنے سامنے جھکی ہوئی دیکھیں گی ـــــ ! یہ آج کل کی بیویاں اپنے شوہروں کے "ویک پوائنٹس" ڈھونڈھنے کی جتنی آرزو مند رہتی ہیں اگر اتنی تمنا اولاد کیلئے کریں تو یقین ملنے اس عالمگیر جنگ کی ہلاکت آفرینی کے باوجود دنیا کی آبادی میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے ۔ ان عورتوں میں چاہے ذاتی طور پر کتنا گہرا اختلاف کیوں نہ ہو لیکن جہاں پر شوہروں کے چال چلن کا بین الاقوامی سوال پیدا ہو جاتا ہے یہ سب ایک پلیٹ فارم پر نظر آتی ہیں ۔ بیگم میں بھی یہی جذبہ کار فرما

تھا۔ اور رسولن نے بُری طرح یہ فریب دے رکھا تھا کہ چھوٹے میاں کی سیاہ اور تاریک زندگی عنقریب بے نقاب ہوا چاہتی ہے! اور یہ حرامزادی بنّو کی بچی .... خدا اسے غارت کرے! بیگم کا چہرہ تمتما اٹھتا جب انہیں یہ خیال آجاتا کہ یہ بنّو میرے سہاگ کی ساجھے دار بننا چاہتی ہے ــــ کمینی ــــ بدذات! میرے شوہر پر اپنی بیباک نگاہوں کے ڈورے ڈالنا چاہتی ہے ــــ خوبصورتی ــــ جوانی ــــ رعنائی، کس چیز میں وہ مجھ سے بڑھکر ہے۔ ہاں ــــ اس کے دیدوں کا ڈھلا ہوا پانی ــــ نوج میری آنکھوں میں ہوتا ــــ چمکیلی ــــ خوفناک ــــ بنّو کی ایسی آنکھیں جن میں شرم وحیا کا نام بھی نہیں کولھے مٹکاتی چلتی ہے چڑیل پرائے مردوں کو رجھانے!

میں کہتی ہوں یہ مرد! اللہ جانے باہری عورت کو دیکھکر اس طرح ایمان کیوں کھو بیٹھتے ہیں جیسے کبھی عورت کو دیکھا ہی نہیں! گھر میں بیوی چاہے جیسی خوبصورت سی خوبصورت بیٹھی ہو ــــ مگر یہ لوگ موئی بازاری ــــ کسبیوں پر ڈانواں ڈول پھرتے ہیں ــــ ان کی مٹکتی ہوئی آنکھوں پر ــــ لچکتی ہوئی کمر پر ــــ عریاں لباس پر ــــ مسکراہٹوں پر! بناوٹی اور جھوٹی اداؤں پر ــــ یہ جو قسمیں کھاتے ہیں سیکڑوں اللہ جانے رسولن ان کی کہاں کی بیرن ہے۔ بنّو سے اس کا کون ــــ سوتیا ناتا ــــ سچ مچ بڑے وہ ــــ معلوم ہوتے ہیں صورت چاہے جیسی مسکینوں جیسی بنالیں ــــ مگر ان کے دل کا چور میں خوب سمجھتی ہوں! جو گرجتے بہت ہیں ــــ برستے کم ہیں۔ بات بات پر قسمیں کھانیوالا ــــ بس اتنا ہی سچ بولتا ہے جیسے دال میں نمک!

مغرب کی نماز پڑھ کر بیگم چوکے ہی پہ گاؤ سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے ان کی آنکھوں پر ہلکی ہلکی غنودگی کا باریک سا پردہ ڈال دیا تھا ــــ سارا گھر کا گھر کام کاج میں مصروف و منہمک تھا۔ کہ نہایت گھبرائے ہوئے عالم میں رسولن نے آکر بیگم کو جھنجوڑا۔

"بیگم ساب، بیگم ساب"

بیگم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔۔۔ رسولن نے ہاتھ کے اشارے سے چپ ہو جانے کی ہدایت کرتے ہوئے دھیرے سے کہا!

"ذرا میرے پیچھے چلی آیئے"

"کہاں" بیگم نے آہستگی کے ساتھ پوچھا ۔۔

"میاں کے کمرے تک" ۔ رسولن نے جواب دیا ۔۔

بیگم جلدی سے اٹھ بیٹھیں ۔۔ ان کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا ۔۔۔ اور غصے کے مارے ان کے سارے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو گئی تھی ۔ ننگے ہی پاؤں رسولن کے پیچھے پیچھے ہو لیں ۔۔۔ چھوٹے میاں کا کمرہ قریب ہی تھا بات کی بات میں دونوں کمرے کے دروازہ پر پہنچ گئے! کمرے کے اندر اندھیرا گھپ تھا اور دروازہ بھڑا ہوا ۔۔ رسولن نے بیگم کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ۔۔۔

"سنیئے"

بیگم نے دل کڑا کر لیا ۔۔۔ دانت بھینچ لئے! اندر سے کوئی عورت چیخ رہی تھی!

"کمینے ۔۔۔ بدذات ۔۔۔ بدمعاش ۔۔۔ چھوڑ دے ۔ چھوڑ دے! مجھے چھوڑ دے! میری زندگی ۔۔۔ آہ میرا جیون تباہ نہ کر ۔۔۔ برباد نہ کر ۔۔۔ اپنے خدا کے لئے چھوڑ دے مجھے!"

بیگم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گئیں ۔۔۔ آوازیں برابر آ رہی تھیں ۔۔۔!

"ظالم ۔۔۔ میری زندگی ۔۔۔ میری آبرو ۔۔۔ اور میرا سب کچھ لوٹ کر تو سکھ نہیں اٹھا سکتا ۔۔ چین نہیں پا سکتا ۔۔ او ۔۔۔ پاپی ۔۔۔ ......!

دوسری سوانی آواز گونج رہی تھی ——

" نہیں —— عشرت —— نہیں! تم —— تم آج میری تمناؤں کا خون کرکے نہیں جا سکتیں —— ہرگز نہیں جا سکتیں! یہاں سے!"

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ظالم مرد نے اس بے بس عورت کو اپنے پنجۂ ہوس میں دبوچ لیا ہے ۔"

ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سارے کمرے میں گونج گئی ——!

بیگم نے دو ہتڑ مار کر دروازہ کھول دیا —— اور چشم زدن میں رسولن اور بیگم کمرے میں پہونچ گئیں ۔ رسولن نے بڑھ کر بجلی کا سوئچ دبایا —— سارا کمرہ برقی شعاعوں سے جگمگانے لگا ۔ بیگم زار و قطار رو رہی تھیں اور رسولن کی آنکھیں کسی مرد کی سہمی ہوئی منفعل آواز پھر کانوں میں گونجنے لگی ——!

"عشرت" مجھے معاف کردو —— اپنے خدا کیلئے بخش دو ۔ بخش دو میں گنہگار ہوں —— پاپی ہوں مجھے معاف کرو —— عشرت ——!"

ہچکیاں لے لیکر روتی ہوئی عورت کی آواز آرہی تھی بیگم پر ایک سکتہ سا ہو گیا تھا ۔ رسولن دم بخود تھی کہ پھر آواز آئی!

یہ لکھنؤ ہے ابھی آپ "پاپی" ڈرامہ سن چکے ہیں ۔ اب آپ کو بنارس کی رمولا بائی ایک گیت سنائینگی جس کے بول ہیں ۔ اندھیارا چاروں اور —— اندھیارا ——!

بالکل اسی وقت چھوٹے میاں کمرے میں داخل ہوتے ہیں ۔

یہ ہیں —— یہ ...... یہ —— ریڈیو کس نے کھولا ——؟

یکبارگی سب کی نگاہیں ریڈیو کی لال لال روشنی پر جا پڑیں —— بیگم دوڑ کر چھوٹے میاں کے قدموں پر! اور رسولن کمرے سے باہر چلی گئی —— یہ کہتی ہوئی!

" اخوہ —— یہ ریڈیو والے ۔

تھارو دیس

"تین تین دن ناغہ کرکے دودھ لاتی ہے لے جا! مجھے نہیں چاہئیے۔۔۔ پرسوں سوموار کو آکر اپنا حساب لے جانا!" مشین بابو نے غصہ میں رعب جماتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابو جی ۔۔۔۔ آج تین دن سے ہم لوگ اپنی "ہٹپا" میں پڑے تھے۔ اسی مارے دودھ نہ آسکا۔ میری "جیا" کو سکھوا بھگا لیگیا۔

اس نے رونی صورت بناتے ہوئے معذرت کی!

تیری "جیا" کو سکھوا بھگا لیگیا ۔۔۔۔ مشین بابو نے تعجب سے پوچھا! کہاں بھگائے گیا ۔۔۔؟

سنا ہے ۔۔۔۔ نوابی بھگا لیگیا ہے ۔۔۔۔ تھارو دیس ۔۔۔!

خوبصورت لڑکی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔۔۔!

تھارو دیس ۔۔۔۔ نوابی!

مشین بابو کے حیرت کی انتہا نہ رہی۔

پھر ۔۔۔۔ تھانے میں رپورٹ نہیں لکھوائی ۔۔۔۔ بابو نے کہا!

بابو غریبی میں کچھ بنائے نہیں بنتا ۔۔۔۔ اور پھر بڑی ندی میں ہیا بھی تو ہے ۔۔۔۔ تھانے جانا مشکل! اس نے جواب دیا۔

چم ۔۔۔۔ چہ ۔۔۔۔ بابو افسوس کرنے لگا۔

ہندوستان کی غریبی کا یہ حال ہے کہ آمدورفت بھی مشکل ہے! وہ سوچنے

لگا ———!

" رجنی تیری " جیا " کا بیاہ نہیں ہوا تھا — کیا —؟

ہوا تو تھا بابو ——— رجنی نے اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے

جواب دیا ——— مگر گونا نہیں ہوا تھا ——— پھر — اب کیا ہو گا!

بابو سوچنے ——— لگا

" کچھ نہیں ——— برادری کی روٹی تو پڑ ہی جائیگی — بھائی بندی کا

کھانا! رجنی نے بالٹی میں دودھ اونڈیلتے ہوئے جواب دیا —

بھائی بندی کا کھانا ———

بابو نے پوچھا!

وہی برادری کی روٹی جو پڑتی ہے بابو ——— پنچ وہ تو دے ہی لینگے

رجنی اس سے زیادہ صاف طریقہ پر اپنا مطلب نہ سمجھا سکی؛

مشین بابو کی حیرت کی انتہا نہ رہی! ایک تو لڑکی ہاتھ سے گئی دوسرے

بھائی بندی کی روٹی! اس کے دماغ میں مفلس ہندوستان کے مکروہ مذموم

رسم و رواج چکر کھانے لگے! مرے پہ سو درے اسی کو کہتے ہیں

اور اگر روٹی نہ دی تو کیا ہو گا ——— رجنی

وہ بولا —

پھر کیا — رجنی نے کہا! بابو برادری والے حقہ پانی بند کر دیں گے

اور کیا!

مشین بابو نے ایک موٹا سا بادامی رجسٹر اٹھا کر اس کے تھملے ہوئے

دودھ کا حساب لکھتے ہوئے کہا!

" اگر تو چاہے تو تیرا حساب آج ہی دیدوں!

بڑی دیا ہوگی ـــــ بابو! رجنی کی آنکھوں سے شکریہ کی بارش ہونیلگی!
وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

مشین بابو نے ایک دوسرا بادامی رجسٹر نکالکر اسکا تمام حساب کر ڈالا ـــــ
انگوٹھے پر نشان لگنے کی سیاہی لگاتے ہوئے اسنے رجنی کی طرف دیکھا۔
رجنی اسکا مطلب سمجھ گئی اور سیدھا ہاتھ بڑھادیا بابو کی طرف!

مشین بابو نے اس کا گرم گرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو ایسا معلوم ہوا کہ بجلی کا
کرنٹ اُس کے جسم سے پاس ہوگیا۔

"تیرا ہاتھ کتنا گرم ہے ـــــ رجنی"
بابو صبر نہ کر سکا۔
رجنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بابو نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی
بڑھتی ہوئی جوانی کی قیمت "روٹی" سے زیادہ نہیں ہے!

گرم گرم ہاتھ کی ملائم انگلیاں انگوٹھے سے علیحدہ کرکے بابو نے سیاہی
کے پیڈ پر اسکا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ذرا ہاتھ ڈھیلا کرو ـــــ
رجنی کا ہاتھ ڈھیلا ہونیکے بجائے کچھ سخت پڑ گیا۔
نہیں ـــــ ڈھیلا کرو ـــــ ڈھیلا ـــــ!
بابو نے کہا۔

رجنی کا تمام جسم کانپ رہا تھا! مشین بابو نے رجسٹر کے ایک کونے پر
اسکا انگوٹھا بنوالیا اور روپے دیدیئے!

رجنی دودھ کا خالی برتن اٹھا کر برگد کے ایک سوکھے پتّے سے اپنا

سیاہی بھرا ہوا ہاتھ پوچھتی ہوئی چلی گئی ۔

مشین والے بابو نے بادامی رجسٹر کو میز کے قریب بچھی ہوئی لکڑی کی پٹائی پر رکھ کر ہرن مارکہ بیڑی سلگالی ۔! اس کی نگاہوں میں دودھ کی تمام بالٹیاں، مکھن اور کریم کی مشین ۔ پھوس کا چھپر ـــ اور بوڑھے برگد کا درخت اپنی زمین بوس گھنی داڑھی کے ساتھ ناچ رہا تھا ـــ ہر چیز جھوم جھوم کر رقص کر رہی تھی ـــ یہ ہندوستان جس کی رومانی زندگی کیف زار دیہاتوں میں کہی جاتی ہے! ـــ اس کے رومان کتنے بھیانک ـــ کٹھن ـــ ہیبتناک مصیبتوں سے بھرے ہوئے ـــ اور پتھر کی سنگدل سلوں کی طرح سخت ہوتے ہیں ـــ جہاں عورت کی عزت ـــ آبرو ـــ اور لاج ـــ کی قیمت سوکھی روٹی کے سماج ـــ یوں تو سبھی ظالم ہوتے ہیں ـــ مگر اس ہندوستان کا سماج کتنا ہلکا اور سُبک ـــ کتنا کم قیمت ـــ اور ـــ اور کتنا حقیر چھوٹا ہے ۔! جس میں عورت کے جمال آبرو ـــ عصمت ـــ اور نسوانیت کا بدل صرف روٹی کے سوکھے ٹکڑے ـــ اور کچھ نہیں؟

اور یہ عورتیں ـــ آخر بھاگ کیوں جاتی ہیں دوسروں کے ساتھ! جب ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی بساطِ زندگی اتنی بے مایہ ـــ اتنی حقیر ـــ اور کم قیمت ہے جس کا معاوضہ روٹی کے چند ٹکڑے ہو سکتے ہیں ـــ تو ـــ! پھر ہندوستان ـــ اتنا تو غریب بھی نہ تھا اگلے زمانے میں ـــ جب ہندوستان پہ ہندوستانیوں کا راج تھا! یہ ایسا سماج کیوں ہو گیا اس زمانے میں آخر ـــ جانے کیوں سماج کے بندھن اتنے ڈھیلے اور کمزور بنا دیے گئے ـــ جانے کیوں! اس کا سر چکرانے لگا ـــ یہ سب

کچھ سوچتے سوچتے۔ اور وہ بھی تو تھا ایک مشین کا بابو ہی! یہ بابو لوگ جو دن بھر پٹواریوں کی طرح سر کھپاتے ہیں ان کے دماغ کتنے محدود ـــــ اور کتنے مجبور ہوتے ہیں! بیچارے ٹھہرے نا ـــــ بابو! ان کی زندگی انہیں موٹے موٹے سفید اور بادامی رجسٹروں میں بند ہوتی ہے ـــــ اس سے زیادہ اور سوچ بھی کیا سکتے تھے ـــ!

دودھ اور کریم کی مشینوں نے ، رکھی ناتھ "کو رکھی ناتھ سے مشین بابو" بنا دیا تھا سارے بانسی پور میں اسے سبھی مشین بابو کہتے تھے شاید وہ سمجھتے ہونگے کہ یہ بابو لوگ بھی کسی قسم کی مشین ہوتے ہیں ـــ حالاں کہ وہ تو صرف مکھن اور کریم کی مشینوں کے بابو تھے۔ جو اودھ ڈیری فارم نے اودھ فارسٹ کے قریب ہی نیپال کی ترائی میں لگا رکھی تھیں ـــــ اور پاس پڑوس کے تمام دیہاتوں کا دودھ خرید کر کریم اور مکھن وغیرہ بنا کر بڑے بڑے ٹین کے پیپوں میں بند کر کے اسٹیشن روانہ کر دیتے تھے اور بس!

رکھی ناتھ کتنے دنوں سے رجنی کو جانتا تھا کوئی دو ڈھائی سال سے! جب وہ بہت چھوٹی تھی! یعنی اتنی جوان نہ تھی جتنی جوان ان دنوں میں ہو چکی تھی ـــــ! چھوٹی لڑکی ـــــ ناسمجھ ـــــ اور اب تو اس کو دیکھ کر مادھو گوالہ تک گنگنانے لگتا ہے۔

"بنجریوں سے مار مار ـــــ ہمکا بلا دین ـــ ہاں ـــ ہاں ـــ۔"

رجنی کی بہن کون ایسی خوبصورت تھی جسکو کھوا نھار و دیس بھگا لیگیا۔ تھارو دیس ـــ شاید اس دنیا سے بہت دور کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں پاپ کو کوئی

پاپ نہ جانتا ہوگا ـــــ نہ وہاں پولیس ہوگی ـــــ نہ تھانہ ـــــ نہ ڈپٹی صاحب ـــــ اور نہ تحصیلدار ـــــ ریل بھی تو وہاں نہ جاتی ہوگی ـــــ جبھی پاپ کرکے سب تھارڈ دیس بھاگ جاتے ہیں ـــــ گنو بھی کہتا تھا کہ تھارڈ دیس میں لڑکیاں بہت سستی بکتی ہیں ـــــ کہو تو لادوں! تمکو بھی ـــــ دو ایک بابو! بڑا "اُچا" ہے یہ گنو ـــــ جسدن مشین پر کوئی لڑکی اکیلی دو دیکھ پہونچ جاتی ہے اس کی سہاگ ہو جاتی ہے ـــــ کس طرح دائیں آنکھ میچ کر بائیں کھول دیتا ہے ـــــ وہ بیچاری دیہاتی لڑکیاں کیا سمجھیں کہ یہ بدمعاش "گنو" آنکھ کیوں مارتا ہے ـــــ وہ مسکراتی بھی نہ ہوں گی ـــــ

اب ان لوگوں کو بھائی بندی کا کھانا دینا ہوگا ـــــ بھگوان کیسے دے پائیں گے یہ پنچایت کی روٹی! غریبوں کو ایک وقت پیٹ بھر کھانا بھی تو نصیب نہیں ـــــ یہ اتنا بڑا کام رجنی کے ماں باپ کیسے کر پائیں گے ـــــ؟

اور اگر پنچایت میں شامل نہ ہو سکے تو پھر یہ سماج کے ٹھیکیدار رجنی کا بیاہ بھی نہ لیں گے ـــــ اور پھر ایشور جانے ـــــ جانے پھر کیا ہو ـــــ

مشین بابو جانے کب تک یہی سب کچھ سوچتے رہے!

"رجنی کی بہن کے بھاگ جانے کے چرچے اب مانسی پور سے نکل کر دُور دور تک پھیل چکے تھے! جو کہتا تھا وہ یہی کہتا تھا کہ یہ سب کچھ کلجگ کی مایا ہے جو بن بیاہی کنیا پرائے انجان مرد کیساتھ بھاگ گئی! ہر جگہ سماج کے کرتا دھرتا ہوتے تو مرد ہی ہیں ـــــ پھر وہ سکھو کو نردوش کیوں نہ ٹھہراتے! حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ سکھو اچھٹا ہوا ـــــ بدمعاش ـــــ آوارہ اور بدچلن لونڈا تھا! ایک رجنی کی بہن

ہی کیا پاس پڑوس کے گاؤں کی دس پانچ لڑکیاں اب تک وہ بھگا چکا تھا، ـــ اور آبرو تو خدا جانے کتنی لڑکیوں کی مٹ چکی تھی اُس کے ہاتھوں ـــ مگر وہ تو "ہرامرد بچہ" ! اگر یہ عورتیں خود ایسی نہ ہوں تو ان کو کون بھگا سکتا ہے ! سماج ـــ کا متفقہ اور اٹل فیصلہ ایسے معاملوں میں عورت کے خلاف ہی ہوتا ہے کیوں کہ ان کے نزدیک عورت پتھر کے ایک بیجان مجسمے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ! اس کے جذبات، اس کے حسیات، اس کی فطرت ـــ سب کچھ مرد کی زرخرید ملک ہے ! تو پھر اس کو یہ حق کب حاصل ہے کہ اس کے جذبات میں کسی قسم کی جوابی کشش پیدا ہو سکے ! مرد چاہے تو عورت کو محبت کا فریب ـــ پریم کا جل ! سبھی کچھ دے سکتا ہے لیکن اگر عورت اپنی زندگی کی تمام بساط مرد کے اعتبار اور اعتماد کے سپرد کر دے تو ـــ رنڈی ـــ بیسوا ـــ اور خدا جانے کیا کچھ ـــ ؟

"نندا" کی آبرو لٹ جانیکے بعد پنچایت کے ٹھیکیداروں نے ہمدردی کا خاتمہ کر دیا۔ منی کی "ہتیا" نندا ہی پر نہیں ! رہی۔ اسکی ماں اور اس کے چھوٹے چھوٹے بھائیوں پر لگا دی گئی ـــ دو سو بھائیوں کا کھانا اور ایک سو ایک روپیہ تاوان ! ـــ ورنہ ـــ ورنہ۔ ظاہر ہے کہ نندا کا حقہ پانی سب کچھ بند ـــ

کچھ ہو ! یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ برادری کی روٹی دیئے بغیر نندا گاؤں کے کسی کنوئیں سے پانی بھر لے ـــ یا کسی کی چلم کو ہاتھ لگا دے ! پنڈت شنکر دین باجپئی سے لیکر کالو چمار تک سبھی خلاف ! حالانکہ ان کو خوب معلوم تھا کہ اگر "نندا ہیر" میں دو سو بھائیوں کو کھانا دینے کی سکت ہوتی تو دو برس سے منی کا گونا کاہے کو ٹلتا رہتا ـــ اور سکھوا کو یہ موقع ہی کیوں مل جاتا کہ وہ پنگھٹ کے پاس

کھڑا ہو ہو کر منّی سے نگاہیں لڑاتا! تالاب کے کنارے بیٹھے ہلکے سروں میں سیٹی بجا کر اپنے انگریزی طرز کے کٹے ہوئے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کرتا ـــــ نندا چاچا کی چوپال میں بیٹھ کر نوٹنکی کی سُنی سُنائی چیزیں کیوں اڑاتا! "ستمگر تیرے لئے"! جیارے ...... ہائے ڈولے رے!" "دیکھو دیکھو جی! بدروا کارے ـــــ جیا نہ ڈرائے" ـــــ! یہ سب کچھ ہوتا تو جبھی! جب نندا کے بنائے کچھ نہ بنا! گونے میں کتنا لمبا خرچ تھا! ابھی تو بیاہ کے قرضوں سے اس کا پیچھا نہ چھوٹا تھا ـــــ جلجیون کی ڈگریاں ـــــ اس کے لہلہاتے ہوتے کھیتوں کو للچائی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں! قسطیں بانٹنے والے کارندے ہر مہینے اس کی بھینسوں اور گایوں کو نیلام کرا دینے کی دھمکی دیتے تھے اور زمیندار کے سپاہی الگ اٹھنا بیٹھنا مصیبت کئے تھے۔ اپنی چوپال میں اُپلوں کے الاؤ پر بیٹھے بیٹھے وہ سوچا کرتا کہ ـــــ بھگوان ـــــ اگلے جنم میں میں نے وہ کونسا پاپ کیا تھا جسکا بدلہ اس جنم میں بھگت رہا ہوں۔ منّی کے بھاگ جانیکے بعد وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکا تھا اور اب اس کے پاس اس طرح جیون میں کچھ بھی باقی نہ تھا جو اسکی زندگی میں آشاؤں کا کوئی بھی دیا جلا سکتا! منّی کی بدوٹی ـــــ رجنی کا بیاہ ـــــ اس کی بڑھتی ہوئی جوانی ـــــ اور یہ کل جگ ـــــ وہ کانپ اٹھتا ـــــ"!

منّی کو بھاگے ہوئے تین چار مہینے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اور غریب نندا کی مجبوریاں اس کی زندگی کا کوئی سہارا پیدا نہ کر سکیں! گاؤں کے آوارہ لونڈوں نے منّی کے بھاگ جانے پر رجنی کو منّی کی بہن سمجھنا شروع کر دیا تھا ـــــ اور وہ بھی

بھی تو منتی کی سگی بہن — یہ اور بات تھی کہ رجنی نے ایک آدھ بار۔ کلو چمار اور سوہنی پاسی کے لڑکے کو نیلی پیلی آنکھیں دکھا کر ڈانٹ دیا! لیکن اس سے گاؤں کے دوسرے مستقل مزاج نوجوانوں کے دلوں پر کب اوس پڑ سکتی تھی — اور گنّو — تو جیسے مشینوں کا بڑا افسر تھا۔ مشین بابو کے بعد — مکھن اور کریم کی تمام مشینیں دھونا۔ پیپوں میں کریم اور مکھن بھرنا سبھی کچھ اس کے ہاتھ میں تھا — دودھ پنواتے وقت تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے والے ہوتے! کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر ایسے کھڑا ہوتا — جیسے تھانیدار! رجنی کے دودھ میں طرح طرح کے عیب نکالنا! کئی کئی بار پنوانا — اور آنکھیں مارنا — گنگنانا۔ اس کے روزمرّہ میں داخل تھا! مشین بابو کو اکثر اس کی یہ باتیں بُری معلوم ہوتیں۔ مگر وہ خوب جانتے تھے کہ گنّو سے بگاڑنا ٹھیک نہیں! اگر اس نے کہیں کریم کا کوئی گھان خراب کر دیا — یا مکھن کا تاؤ بگاڑ دیا — تو کمپنی والے اُس پر جرمانہ کر دیں گے — وہ نوکری سے ہٹا دیا جائیگا — ایسی اچھی نوکری اس زمانہ میں کہاں مل سکتی ہے — بڑے بڑے بی اے اور ایم اے مارے مارے پھرتے ہیں — وہ تو صرف میٹرک فیل ہے —

دُودھ کی بالٹیاں کھنکھناتے ہی گنّو اپنے کوارٹر سے باہر آ گیا۔ برگد کے اُسی گھنے پیڑ کے نیچے جس کی لمبی داڑھی میں سبھی جھولا جھولتے تھے — ساون کے دن آئے سکھی ری — ساون کے دن — اس نے گنگنا کر برگد کی داڑھی کو ایک جھونکا دیدیا — شیامو نے اپنی بالٹی دوسری طرف کھسکا دی — اور کھڑا ہو گیا —!

جے رام — دادا!

جے رام — بھائی — جے رام جی کی —!

گنّو نے آنکھ کے اشارے سے بُلاتے ہوئے کہا! شیامو اُٹھکر گنّو کے قریب پہنچ گیا اور دونوں دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے کواڑ میں چلے گئے!

" کہو یار — کیا رنگ ہیں! کیا کہتی ہے اب!

" گنّو دادا — وہ بڑی ضدن ہے — مانتی نہیں!

شیامو نے جواب دیا —

واہ بھائی — یہی کہتے تھے کہ میرے کہے میں ہے! جاؤ — بس! دیکھ لیا —!

گنّو نے کہا —

گنگا کی قسم " شیامو بولا " جھوٹ نہیں کہتا —!

" ابے جا " گنّو مسکرایا " بس ایکدفعہ ملوا دے! پھر دیکھ لینا —!

ہاں یہ بات ہے — تو رہی!

شیامو کہنے لگا!

لاؤ ہاتھ —!

گنّو نے بات پختہ کرنے کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا! شیامو نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار دیا اور دونوں مسکراکر کواڑ سے باہر نکل آئے —!

دوسرے دن شام کو گنّو جب کریم اور مکھّن کی مشینوں کو گرم گرم کھولتا

ہو — پانی سے دھو کر بالٹیاں رکھنے کیلئے مشین بابو کے کوارٹر میں آیا تو اس نے لالٹین کی دھیمی لو —— کچھ اور تیز کر دی!

مشین بابو —— کیا سو گئے!

لالٹین کی تیز تیز شعاعیں بابو کی بند آنکھوں پر جسم گئیں اور پپوٹوں کی کھال جھلملانے لگی!

گنو نے دھیمے سُروں میں وقت کی ایک تان اڑا دی —

" اندھیرا یا ہو رات سجن —— رہیو کہ جیو "

" رہیو کہ جیو " ہاں —— ہاں —!

مشین بابو نے کروٹ لے لی!

کیا ہے گنو —؟

ابھی سے —— بابو سرِ شام ہی لیٹ رہے! کیا بہت تھک گئے

—؟ گنو نے کہا، " بدن داب دوں تمہارا —؟

نہیں جی —— کچھ ایسا تھوڑا ہی تھکا ہوں!

مشین بابو نے جواب دیا "

اور بھی کچھ سُنا — گنو کہنے لگا! وہ منی کی بہن! رجنی بھی اب پر نکال رہی ہے —!

وہ کیسے —؟

مشین بابو نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا!

جیسے اس کی بہن منی نکال چکی ہے ——!!

گنّو مشین بابو کے پلنگ سے اور قریب ہو گیا! کہنے لگا ــــ

" اور کرینگی بھی کیا! بیاہ منگنی ہونے سے رہا ــــ یاروں کے پہلو گرم نہیں کرینگی تو کرے گی کیا ــــ؟ اسکی آنکھوں میں شرارت چمکنے لگی ــــ

مشین بابو کو سکتہ سا ہو گیا ــــ مگر گنّو سے کچھ کہنے کی ہمّت نہ پڑی

گنّو کچھ دیر مشین بابو کے انتظار میں کھڑا رہا کہ شاید اب کوئی بات چیت شروع کریں ــــ اب کچھ پوچھیں! لیکن جب مشین بابو کی چارپائی نے کروٹ کا الارم بجا دیا تو آہستہ آہستہ وہ دروازے سے باہر نکل گیا ــــ

بوڑھے برگد کی داڑھی چاندنی رات میں اس طرح پریڈ کر رہی تھی جیسے پوری بٹالین جرمنی کے محاذ پر مارچ کیلئے تیار ہے! برگد کی شاخوں میں چمٹے ہوئے چمگاڈر چاند کی روشنی سے گھبرا رہے تھے اور ان کی پھڑپھڑاہٹ چاروں طرف فضا میں چھائی ہوئی تھی! گنّو جب برگد کے دوسرے کنارے پر پہونچا تو اس کے قدم خود بخود ٹھہر گئے!

" وہ " شیامو کی پیٹھ سے چمٹی ہوئی کھڑی تھی ــــ اور اس کا تمام بدن بید کی طرح سے کانپ رہا تھا ــــ

گنّو نے پوچھا!

" آ گئے شیامو "

ہاں ــــ دادا ــــ بڑی مشکل سے چھپ کر آئی ہیں دھارانی ــــ!

شیامو نے جواب دیا ــــ!

جیتے رہو ــــ میرے یار! گنّو کہنے لگا! رجنی شرماتی کیوں ہو ــــ!

میں ہوں تمھارا گنوّ ——— !

شامو رجنی کے سامنے سے ہٹ گیا اور رجنی کا چہرہ چاندنی میں کُندن کی طرح چمکنے لگا۔

" جو ایک بات پوچھیں تم سے۔ بتادو گی "

گنوّ رجنی کے قریب پہونچگیا ———

اس نے کوئی جواب نہیں دیا ———

بولتی کیوں نہیں رجنی !

گنوّ نے پھر پوچھا ———

" ہاں " کہکر رجنی نے نگاہیں جھکالیں ——— !

پنچائیت تو جیسے ہوئی نہیں، گنوّ کہنے لگا! اب تمہارا کیا ہوگا۔ ؟

رجنی چُپ چاپ کھڑی رہی ———

میں کہتا ہوں کہ تم میرے سنگ آجاؤ ———

رجنی اب بھی کچھ نہ کہہ سکی۔

" بولتی کیوں نہیں۔ مجھپر وشواش نہیں ہے تم کو ——— !

گنوّ نے رجنی کی آنکھوں میں آنکھیں جمادیں ———

شیامو ——— کچھ دُور بیٹھا ہوا بیڑی پی رہا تھا! دونوں کی نگاہوں نے مسکراہٹ میں بدلتے ہوئے خدا جانے کیا فیصلہ کرلیا۔ گنوّ نے آواز دی۔

" شیامو ——— وہاں کیوں بیٹھ گیا ——— آتا کیوں نہیں ———

کہو کیا ٹھہری گنوّ دادا ——— شیامو پاس آگیا!

ایشور کی کرپا سے بیڑا پار ہے شیامو ---!

دونوں مسکرانے لگے! رجنی شیامو کی پیٹھ سے آڑ دیکر گاؤں کی طرف چلدی --- " وہ بھی مسکرا رہی تھی " ---

---

" رجنی " بھی پر نکال رہی ہے ---! یہ سوچکر مشین بابو کی طبیعت میں بھی ایک اکساہٹ سی پیدا ہونے لگی تھی۔ حالانکہ ان کے دل میں عورت کے خلاف وہ لاشعوری جذبے موجود نہیں تھے جو عام طور پر نیلی نیلی اور بھڑکیلی ساریوں کو دیکھکر اچانک پیدا ہو جاتی ہیں آج کل مردوں میں ---! غیر امتیازی طور پر وہ ہر عورت کو دیکھکر کچھ ایسا ہی سوچنے لگتے ہیں جنکو سوچنے کا ان کو نہیں اس طرح پر کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ مشین بابو کے دل میں انسانیت اور ہمدردی کا جذبہ اگرچہ فطری طور پر موجود تھا لیکن " جنسی اکساؤ " بھی تو آخر انسانی فطرت کا ایک جاگتا ہوا جذبہ ہے --- مشین بابو لاکھ بابو قسم کے انسان سہی، پھر بھی تھے تو مرد ہی! چٹیل میدان میں آزاد بہتے ہوئے دریا کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دیکھکر یوں بھی پیاس لگ آتی ہے --- اور پھر رجنی کے تو " پر نکل رہے تھے " وہ سوچنے لگے کہ گنو " رجنی " کی کہانی کیوں دہرا رہا تھا! وہ کیوں یہ سب کچھ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ضرور --- مجھے بھی دعوت دی تھی اس نے --- میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیکر ٹھکرا دیا --- دعوت کو! برا کیا۔ اب کہوں گا گنو سے کہ مجھے معاف کر دے --- میں اس وقت نیند میں تھا --- ہاں کیا ہوا رجنی کا معاملہ!......

یار گنو ہم بھی ہیں تمہارے ساجھے دار! ہمیں نہ بھول جانا --- اس کی بڑی بڑی آنکھیں۔ دبلا پتلا جسم! اور مخمور جوانی! یہی کہلاتے ہیں گدڑی کے لال ---!!

گلے اور بھینسوں کے گلے گھنٹیاں بجاتے ہوئے اس کے کوارٹر کے سامنے سے جنگل کی طرف دھول اڑانے لگے! اس کے خیالات کا سلسلہ ان گھنٹیوں کی آوازوں میں کھو گیا۔ جلدی سے وہ اٹھا اور کوارٹر کے باہر نکل آیا ــــ برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے سب دودھ والے دودھ کے مٹکے لئے ہوئے قطار باندھے بیٹھے تھے۔ اور گنّو بالٹیوں میں دودھ پنوار ہا تھا!

مشین بابو دھیرے دھیرے برگد کے داڑھی سے کھیلتا ہوا دودھ والوں کی قطار کے پاس پہونچ گیا! اس کے پاؤں خود بخود بوجھل ہونے لگے۔ برگد کی داڑھی کا ایک بال زمین کی تہ میں پیوست ہو گیا جیسے کوئی دوسرا درخت برگد کے نیچے جنم گیا ہو۔ رجنی اُسی داڑھی کے گچھے سے سہارا لئے بیٹھی تھی! مشین بابو کو یاد آ گیا کہ اس کی بہن منّی تھارو دیس بھاگ گئی ہے۔ اور اس کے گھر والوں نے ابھی تک پنچایت کی روٹی بھی نہیں دی۔! یہ لوگ کتنے مجبور و مظلوم ہیں ــــ غریب ــــ نادار ــــ مفلس ــــ! سماج نے ان کی زندگی کی آشاؤں کا گلا گھونٹ دیا ہے! مگر ــــ اچانک گنّو کے سلام نے اسے چونکا دیا ــــ اور ہمدردی کے جاگے ہوئے جذبے جنسی طوفان میں سو گئے! رجنی کے پر نکل رہے تھے!۔ اور وہ اڑ رہی تھی بہت بلندی پر! سماج والے اسے اڑا رہے تھے کسی ہوائی جہاز پر ــــ جو نوجوانوں کے امنڈتے ہوئے دلوں پر پریم کے گولے برسا رہا تھا۔ انسانیت کا جذبہ بیشک فطری چیز ہے لیکن یہ اکساؤ بھی تو فطرت کی دی ہوئی ایک سوغات ہے! یہ وقت کی چیز ــــ وقت کا نغمہ ــــ اور انسانیت و ہمدردی کے جذبات بڑھاپے کا وچار ــــ آخری وقت کی ایڈجسٹمنٹ! ہر چیز اور ہر بات اپنے وقت پر شوبھا دیتی ہے۔ دن کو رات کی ایسی مست نیند ممکن نہیں! جوانی کی

آشائیں، اور امیدیں ۔۔ بڑھاپے میں کبھی کام نہ آئینگی۔ جوانی غلش کیلئے اور بڑھاپا سکون کے لئے، دوسرے جیون کے سدھار کی دعاؤں کیلئے!! مشین بابو نے تھوڑی دیر میں جانے کتنا سوچ لیا۔ لکڑی کے تختوں سے جڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہی ان کی نگاہیں رجنی کی طرف اٹھ گئیں ۔۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی برگد کے ایک سوکھے ہوئے پتے میں سوراخ کر کے ایک چھوٹی سی لکڑی میں پرو لیا تھا اس نے ۔۔! بچپن اور کمسنی بھی عجیب چیز ہوتی ہے ۔۔ جانے اس نے کیوں ایسا کیا تھا ۔۔؟

گنوؔ شیامو کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بھرپور نگاہ جما کر رجنی کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا کہ ہنس رہا تھا مشین بابو کی حماقت پر! اپنے نمبر پر رجنی دودھ لیکر بالٹیوں میں ناپنے لگی۔ ۔۔ تو گنوؔ نے اس کے پیر کے انگوٹھے کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا لیا!

مشین بابو بادامی رجسٹروں پر آنکھیں جمائے ہوئے آج کے آئے ہوئے دودھ کا حساب لکھ رہے تھے ۔

سورج ڈوبنے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی کہ مویشیوں کے گلے گھنٹیاں بجاتے ہوئے جنگل سے لوٹنے لگے۔ مشین بابو نے لکڑی کے بڑے سے بکس میں رجسٹروں کو رکھکر تالا لگا دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے ۔۔۔ وہ روز اسی وقت اپنا آفس چھوڑ دیتے تھے۔ یہی گھنٹیاں ان کی گھڑی تھیں۔ سویرے جب جانوروں کے گلے جنگل جاتے تو یہ مشینوں پہنچ جاتے۔ اور ان کی واپسی پر کوارٹر واپس آتے۔ گویا وہ بھی ایک قسم کے جانور تھے جنکا پروگرام انہیں جانوروں کے ساتھ تھا! اپنے کوارٹر میں پہونچکر مشین بابو نے دھوتی اور لوٹا اٹھا لیا ۔۔ ہاتھ سے چلانے والے پمپ پر پہونچ گئے۔ سامنے ہی گنوؔ کا کوارٹر تھا آواز دی ۔۔!

"ارے گنوّ کیا کر رہا ہے"۔؟

گنوّ اپنے کوارٹر سے باہر نکل آیا۔

کچھ نہیں بابو —— کیا نہاؤ گے —— ؟

"ہاں بھائی ——! آجاؤ! بابو بولے —!!

گنوّ بمبے پر آ گیا اور ہتھا چلانے لگا!

مشین بابو نے دیسی صابن جیب سے نکال لیا اور بدن میں رگڑنے لگے۔

ارے یار —— گنوّ اس دن رات کو کیا کہہ رہے تھے تم! میں تو نیند میں تھا کچھ سُن نہ پایا ——

مشین بابو نے کہا!

کیا بابو جی —— ؟

گنوّ نے پوچھا —!

"اجی وہی رجنی والی بات"! مشین بابو نے جواب دیا۔

"ہاں یہی کہہ رہا تھا کہ —— گنوّ بولا — کہ رجنی بڑے زوروں پر ہے آج کل۔

"تو کیا صلاح ہے اُستاد"۔؟

مشین بابو نے یارانہ کرتے ہوئے پوچھا ——!

اب کیا بتاؤں بابو —— ؟ گنوّ نے کہا۔ معاملہ! سب بگڑ گیا بابو نہیں تو —!

"نہیں تو —— مشین بابو نے پانی کی دھار سے جھانک کر پوچھا۔

"بڑے آنند رہتے"

گنوّ مسکرانے لگا —!

"اب کوشش کرو — ہم بھی ساجھے دار ہیں تمہارے۔
مشین بابو بولے —!
گنّو نے کہا — ہاں — منظور!
"سچ کہتے ہو گنّو! مشین بابو نے کہا —
اگر لگ گیا داؤں —— تو ضرور!
وہ بولا —
بمبے کے پانی میں ریت آنا شروع ہو گئی تھی! مشین بابو بمبے کے نیچے سے
ہٹ آئے! گنّو کے ہاتھ ہتھے پر رک گئے! کیا ہے بابو —؟
کچھ نہیں — ریت آنے لگی پانی میں! رہنے دو! بس نہا چکا!
یہ بمبے بڑے خراب ہوتے ہیں!
گنّو نے جواب دیا!
مشین بابو دھوتی بدلکر اپنے کوارٹر میں چلے گئے! اور گنّو اپنے کوارٹر میں —!

کہاں تو مشین بابو میں انسانیت اور ہمدردی کے جذبے طوفان بپا تھے
کہاں یکایک جنسی جذبات نے بغاوت شروع کر دی۔ اب وہ رہ رہ کر یہ سوچنے کی
کوشش کر رہے تھے کہ کس طرح "رجنی" کی مجبوری اور بےبسی سے فائدہ اٹھا کر
گنّو کو اپنا بنا کر! اس موقع سے فائدہ اٹھالیں۔ ادھر گنّو نے شیامو کو ملا کر رجنی
پر اس طرح قبضہ کر لیا تھا کہ درحقیقت اب وہ اپنے لئے شیامو کو بھی ایک
طرح کا کانٹا ہی سمجھتا تھا۔ "رجنی" گنّو کیلئے اتنی بیباک ہو چکی تھی کہ اس کیلئے

شیامو کے وسیلے کی ضرورت ہی نہ تھی! اکثر رات کو اسی برگد کے گھنے سائے کے نیچے گنوّ بیڑی پی پی کر اس کی راہ دیکھتا کرتا تھا ـــــ اور جب دھندلے دھندلے تاریک سایہ میں پر احتیاط حرکت پیدا ہونے لگتی تو وہ جلدی سے اپنی ادھ جلی بیڑی پھینک کر اسی سائے کی طرف بڑھ جاتا ـــ نجانے کتنی کتنی دیر دونوں برگد کی داڑھی میں اُلجھ اُلجھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے ـ

کئی بار مشین بابو نے چھپ چھپ کر ''رجنی اور گنوّ'' کی بہت سی باتیں سنی تھیں ـــ کیسی باتیں ـــ جس کو سن کر ان کے رونگٹے تھرّا اٹھتے! جماہیوں پر جماہیاں آنے لگتیں ـــــ اور وہ گنوّ کی قسمت پر رشک کرتے کرتے ''رقابت'' کے حدود تک پہونچ جاتے ـ وہ سوچنے لگتے کہ یہ گنوّ ـــ ایک چھوٹا ـــــ اور غریب آدمی! کس طرح رجنی ایسی خوبصورت لڑکی پر قبضہ کئے ہوئے ہے ـــ حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ـــــ جوان ـــــ اور پھر مالدار! لیکن نہ جانے کیوں رجنی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی ـــــ اسکو دیکھکر نگاہیں جھکا لیتی! ـــــ راہ کاٹ جاتی ـــــ گویا ـــ نفرت کرتی ہے ـ اس سے ـــ!

مشین بابو نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا ـــــ اندھیرا ہو چکا تھا ـ گنوّ نے دھیرے سے اپنے کوارٹر کے دروازے بھیڑے ـــ اور بوڑھے برگد کیطرف دبے پاؤں چلنے لگا ـــــ برگد کی داڑھی ٹھنڈی ہوا میں لہرا رہی تھی ـــ اس نے ماچس سُلگا کر بیڑی جلائی اور برگد کی داڑھی کے ایک موٹے سے بال کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا ـــــ مشین بابو بھی چپکے سے اپنے کوارٹر کے باہر آ گئے ـ چھپ کر

گنو کے قریب ہی برگد کی جڑ کے پاس ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے! ایسے ہی اکثر چھپ چھپ کر انہوں نے دونوں کی باتیں سُنی تھیں ــــ گنّو نے ایک لمبا کش کھینچکر بیڑی بجھا دی ــــ وہ سامنے ہی آرہی تھی ــــ چند قدم آگے بڑھ کر اُسنے اپنے دل کی حرکتوں کو اس کے تیز تیز تنفّس میں گم کر دیا ــــ!

تم آگئیں ــــ رجنی -؟

آج مجھے بڑی دیر ہو گئی ــــ گنّو۔

اس کی سانس اب بھی بے ربط سی تھی!

کیا ہُوا ــــ پیاری

گنّو نے پوچھا

کچھ نہیں ــــ وہ بولی ــ دادا کی طبیعت کچھ خراب تھی۔

کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے ــ

گنّو نے پھر سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔

" رجنی! وہ مشین والا بابو تم پر بُری طرح ریجھا ہے "!

رجنی نے کوئی جواب نہیں دیا ــ!

بولتی کیوں نہیں رجنی! وہ بولا! مشین بابو تو میرا سا ب چھے وار ہے،

کیا کہا تم نے گنّو! کیا میں کوئی بیسوا ہوں! رجنی نے جواب دیا ــ!

نہیں میرا مطلب تم نہیں سمجھیں ــــ گنّو کہنے لگا! وہ بھی اپنا سنگھی ہے،

آخر ستیا ہو ......! وہ بولی!

بس رہنے دو ستیا مو کو تمہیں نے تو کہا تھا ــــ!

اور بابو کو بھی میں ہی کہہ رہا ہوں! گنّو نے جواب دیا ـــ!

چُپ رہو ـــ کیا کہتے ہو ـــ اب یہ نہ ہوگا! رجنی نے خفت کے ساتھ جواب دیا!

تو آخر ان میں کیڑے ہی کون سے پڑ گئے! گنّو بولا ـــ!

رجنی نے جواب دیا۔

یہ شہر والے ہیں ـــ ان کی اور ہماری دوستی ہی کیا ـــ؟

گنّو ہنسنے لگا۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا تم سے ـــ ہاں اب یہ بتاؤ "تھارو دلیس" کب چلو گی ـــ؟"

اچانک بوڑھے برگد کی داڑھی میں چمٹے ہوئے چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ نے دونوں کو چونکا دیا ـــ مشین بابو سمجھے کہ جیسے ان کی تاک جھانک کا بھید کھُل گیا ہے ـــ برگد کی جڑ سے نکل کر وہ بھیانک تاریکی میں اپنے کوارٹر کی طرف چلے گئے ـــ!

اللہ کی دین!

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین رُکی ہی تھی کہ مسافروں کا ٹڈی دل ٹوٹ پڑا پہلے ہی سے سارے درجہ میں سانس لینے کی جگہ نہ تھی کہ ایک ادھیڑ عمر نیم مولوی جسم کے انسان معہ اپنی تمام گھبراہٹوں اور کنبے سمیت داخل ہونا شروع ہو گئے۔ سیاہ رنگ کے برقعہ میں ایک عورت لپٹی لپٹائی اور پون درجن کے قریب مختلف سائز کے لڑکے اور لڑکیاں۔ ایک آدھ بکس، بستر، لوٹا، اور خدا جانے کیا کچھ، سارے درجہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، کھڑکیوں پر آدمی۔ سامان رکھنے کی جگہوں پر آدمی، فرش پر آدمی۔ عرش پر آدمی حتیٰ کہ پائخانہ کے اندر تک آدمی کھڑے تھے۔ اس کنبہ کے داخل ہوتے ہی سب حیرت میں تھے کہ یا اللہ یہ سب لوگ کس طرح اِس کمپارٹمنٹ میں سما سکیں گے جہاں ہوا تک آنا مشکل ہو چکا ہے۔ لیکن تعریف اس کمپنی کی جس نے عمرو عیّار کی زنبیلیں بنا کر ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہی نہیں کہ اس لڑائی کے زمانہ میں یہ ٹرینیں حسبِ ضرورت غیر معمولی طور پر گھٹ بڑھ جایا کرتی ہیں اور ان سیٹ پر جن کے سرہانے لکھا ہوتا ہے۔ بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ، خود بخود ڈھائی درجن آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ پیدا ہو جایا کرتی ہے بلکہ لطف یہ کہ ان آدمیوں میں سے کوئی بھی جان بحق تسلیم نہیں ہوتا۔ گویا کہ یہ ہندوستانی ریلوں کا ایک

معجزہ ہے معجزہ ——!

پہلے جب یہ کنبہ داخل ہونا شروع ہوا تو ہر شخص بیک زباں خستگی میں یہی چیخ رہا تھا کہ جگہ نہیں ہے، ڈبہ پورا ہے ڈیوڑھا، رحم کیجئے صاحب رحم، مگر جب ایک ایک کر کے یہ ایک درجن کے قریب مخلوقِ خدا مع اپنے تمام اسباب کے داخل ہوگئی۔ تو یقین جانیئے کہ ہم تمام لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کھڑے ہونے کی جگہ پاکر انسان پاؤں پھیلانا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ مولانا نے آتے ہی اپنی محترمہ کے لئے ہمدردی کی بھیک مانگنا شروع کردی ——

" زحمت تو ہوگی —— اِک ذرا سی جگہ —— جی میرے گھر میں علیل ہیں کچھ ——"

حالاں کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اس سارے ڈبہ میں بیٹھنے کیا کھڑے ہونے کی گنجائش نہ تھی۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کا منہ اور مولانا کا حدود اربعہ دیکھ کر خاموش ہو جاتے تھے! اور جواب ہی کیا دے سکتے تھے۔

مولانا نے اپنا احتجاج صدا بصحرا دیکھتے ہی دوسری کوششیں شروع کردیں اوپر کی برتھ پر رکھے ہوئے سامان کی الٹ پھیر کر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے کو ماں کی گودی سے لیکر اوپر لٹا دیا —— اب جاپان اور جرمنی کی طرح تجارت کیلئے دوسری منڈیوں کی تلاش تھی —— کیونکہ علاوہ ان کے گھر میں کے ابھی صرف آدھ قطعہ لڑکے اور لڑکیاں اور بھی موجود تھے جن کے لئے اچھی سے اچھی جگہ کی ضرورت تھی ——

بہر حال ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، مولانا نے کوشش کر کے اوپر والی برتھ پر ایک صاحبزادے کے لئے اور بھی جگہ نکال لی۔ سارے کمپارٹمنٹ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی مسافر ایک لمبی سی جماہی لیکر اللہ یا رام ضرور کہہ دیتا۔ البتہ مولینا دوسرے کے بعد تیسرے کی فکر کر ہی رہے تھے کہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک خاں صاحب بول اُٹھے۔ غالباً مولینا انھیں کے سامانِ سفر کی مرمت شکست وریخیت فرما رہے تھے۔

"کیا ارادہ ہے" خاں صاحب نے کہا۔ ملا جی! کیا سامان پھینک دو گے۔؟

"جی نہیں" مولانا بولے! ٹکٹ ہم نے بھی خریدا ہے جناب!

"دوسروں کا سامان پھینکنے کے لئے" خاں صاحب کا جواب بھی نرم تھا۔

"کچھ ہو صاحب" مولانا نے فرمایا! لڑکے بھی تو نہیں پھینکے جا سکتے۔"

"تو جہاں جگہ ہو لڑکوں کو بٹھال دیجئے ——— مگر سامان! خاں صاحب نے جواب دیا ——"

"آپ کے سامان کی ذمہ داری کسی نے نہیں لی ہے" مولانا آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے ——"

اب معاملہ خاں صاحب کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا آستینیں چڑھا کر کھڑے ہو گئے "لگایئے تو سامان کو ہاتھ"

"دیکھیئے ابھی لیجئے"

"ہاں —— ہاں —— سامان کو ہاتھ لگایئے"

"ابھی —— ابھی ——" مولانا دور سے گیدڑ بھبکیاں دکھا رہے تھے"

"جیسے ساری گاڑی آپ نے خرید لی ہے" مولانا کہہ رہے تھے۔!

"اور ——— نہیں ——— تیرے باپ کی ہے" خاں صاحب تو تکار تک آ گئے تھے ——!

"دیکھیئے ——— دیکھئے ——— زبان سنبھال کر ———" مولانا نے تہذیب سے کہا۔

"تیری زبان سمجھا ———" خاں صاحب عنقریب تھا کہ مولانا پر آ جائیں دو چار آدمیوں نے بیچ بچاؤ کر دیا ——— اب مولانا کھڑے کھڑے بڑبڑا رہے تھے اور خاں صاحب اپنی طرف اردو کے معلیٰ بول رہے تھے۔

میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب جو غالباً یہ سوچ رہے تھے کہ اگر ہندوستان میں اتحاد و یک جہتی ہو جاتی تو سارا ہندوستان ہندوستانیوں کا تھا۔ اس خالص بین الاقوامی اختلاف کو نہ دیکھ سکے۔ رنگین شیشوں کی عینک سے جھانک کر بولے۔

"ملا جی ——— آج کل بال بچوں کو لیکر سفر کرنیکا زمانہ نہیں ہے۔

گو کہ مولانا کسی دوسرے محاذ کیلئے تیار نہ تھے مگر ڈیفنس تو ہر حال میں ضروری تھا —— جواب دیتے ہیں —!

"منشی جی ——— پھر ان بچوں کو کس جہنم میں جھونک دوں"

"نہیں جہنم میں جھونکنے کا سوال نہیں" منشی جی کہنے لگے "میرا مطلب یہ ہے کہ آج کل بال بچوں کو لیکر سفر نہ کرنا چاہیئے ——"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں" مولانا نے جواب دیا "مگر بچوں کو کس پر چھوڑ آؤں ——— یہ تو بغیر میرے ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے ——"

برابر والی سیٹ سے ایک نوجوان نے دخل در معقولات کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن صاحب یہ درجنوں لڑکے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی"

سارے درجہ میں ایک قہقہہ بلند ہو گیا۔

"ضرورت کیسی" مولانا منقولات پر اتر آئے — یہ تو خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے، معاف کیجئے گا۔ آپ کے معلوم ہوتا ہے ابھی کوئی اولاد نہیں ہوئی — ورنہ ——!

"ورنہ ——" نوجوان نے بات کاٹ کر کہا "ورنہ ضرور خودکشی کر لیتا میں ——"

سب لوگ پھر ہنسنے لگے۔ مولانا کچھ جھینپ سے گئے۔ بولے!

"عزیزم! جب ہی تو آپ کو اولاد کی قدر نہیں ہے —— یہ اللہ کی دین ہے۔ اللہ کی دین ——!

یکایک ایک زور کے دھچکے سے گاڑی ٹھہر گئی —— سب لوگ درجہ سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگے کہ ماجرا کیا ہے ——؟

لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ ہانپتے کانپتے گارڈ صاحب تشریف لائے۔

"زنجیر کھینچی گئی ہے"

ہم لوگ حیرت میں تھے۔

"یہاں تو کسی نے زنجیر نہیں کھینچی"

"ضرور کھینچی کسی نے" گارڈ نے کہا۔

ہم لوگ اپنی اپنی طرف نظر اٹھا کر چین دیکھ رہے تھے کہ گارڈ نے داخل ہوتی ہی کہا "وہ دیکھئے"

اب جو نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو مولانا کے ایک صاحبزادے یہ فرض انجام دیکر اپنی کامیابی پر مسکرا رہے تھے۔

بچہ کی شرارت تھی لیکن پھر بھی گارڈ نے مولانا کا نام و پتہ مع مکمل ولدیت کے اور ہم لوگوں کا نام و نشان نوٹ کر لیا۔ خدا خدا کر کے ٹرین روانہ ہوئی۔

گاڑی چلتے ہی نوجوان نے پھر مولانا کو چھیڑنا شروع کیا۔ لیکن ولدیت وسکونت لکھ جانے سے مولانا کچھ ایسے گھبرائے تھے کہ ایک لفظ بھی نہ بولے۔!

کوئی پانچ ہی منٹ کے بعد ٹرین پھر آہستہ ہونے لگی۔ ہم لوگوں کا خیال ہوا کہ کہیں پھر تو چین نہیں کھینچ لی چھوٹے مولانا نے۔ لیکن یہ بات نہ تھی بلکہ ایک اسٹیشن تھا، ہندو پانی، مسلم پانی، پوری مٹھائی والے چیخ رہے تھے۔!

گاڑی کا رکنا تھا کہ مولانا کی محترمہ نے برقعہ سے براڈ کاسٹ کیا "اے اے میں کہتی ہوں سنتے کیوں نہیں۔ چنّو کیلئے ایک جھنجھنا لے لو"!

مولانا ابھی محترمہ کا میسج لے ہی رہے تھے کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اچھے ابّا کیلے لیں گے"

"اماں جان گڑیا لے دو۔"

اللہ کی دین ۳ نے فرمائش کی، "اچھے ابّا گیند، ویسا ہی جیسا مسعود کے پاس ہے۔"

مٹھائی بسکٹ، اللہ کی دین ہے نے کہا۔

اوپر کی برتھ پر جو صاحبزادے تشریف رکھتے تھے ہکلا کر بولے۔

"ہم بھی لے دیں ابّا"۔ (ہم بھی لیں گے ابّا)

مولانا ہکّا بکّا ہو ہو کر سب کو تسلّی دے رہے تھے۔ دراصل وہ بیچارے زنجیر کھینچنے کے واقعہ سے کچھ اتنا گھبرائے تھے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ شائد اُن کا خیال تھا کہ اب مقدمہ ضرور چلیگا۔ اور اگر پھانسی نہ ہوئی تو جیل ضرور ہو جائے گی۔ مجھے نابالغ بچّہ کا میں ولی ہوں نا۔!

ابھی مولانا اسی اُلجھن میں بیوی بچوں کو تسلّی دے رہے تھے کہ ناگہاں اوپر کی سیٹ پر لیٹے ہوئے سب سے چھوٹے بچّے نے چونک کر رونا شروع کر دیا۔

"ذرا کفو کو"۔ بچہ کی ماں بولیں "اوپر سے اٹھالو"۔

"اجی کہاں اٹھالوں" مولانا نے بگڑ کر کہا۔ "دیکھتی نہیں ہو کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ہے، رونے دو۔ استغفراللہ۔!

"کہیں کسی پر پیشاب نہ کردے" وہ بولیں۔

"پیشاب کیا کردیگی" مولانا نے جواب دیا "کیا پیشاب کرایا نہیں تھا۔

"کرایا تو تھا۔ مگر شائد" بچوں کی ماں بولیں "اٹھالو"

"خاموش رہو کیوں بیکار جھک جھک لگا رکھی ہے" مولانا بولے!

اب "کفو" اور بھی چیخنے لگی۔ محترمہ کے بے انتہا اصرار پر مجبور ہو کر مولانا نے لڑکی کو گود میں اُٹھالیا۔ اب کی بیگم صاحبہ بولیں۔!

"پیشاب کرالو۔"

"بیکار کہتی ہو" وہ پیشاب نہیں کرے گی، مولانا نے کہا۔

بیگم صاحبہ نے کئی بار کہا مگر مولانا نے سنی ان سنی کر دی۔ لڑکی بدستور رو رہی تھی اور مولانا گود میں لئے ہوئے چمکار رہے تھے۔ یکایک مولانا کے پاس بیٹھے ہوئے مسافروں نے کچھ تراوٹ محسوس کی۔ ایک مہاشہ جی نے جن کی گردن پر کئی قطرے ٹپک گئے تھے نظر اٹھا کر دیکھا تو رام رام کہہ کر چیخ اٹھے۔ پاس پڑوس کے دو چار آدمیوں نے مزید جستجو شروع کی تو معلوم ہوا کہ مولانا کی گفو باپ کی آغوشِ محبت میں حوائجِ ضروری سے فراغت کر چکیں۔ کچھ عجب عالم تھا اس وقت کا سب لوگ گھبرائے ہوئے تھے۔ اور مولانا کی شیروانی سے پائجامہ تک یہ حال تھا۔ کہ

میاں ٹک بڑھا کے لیگیا چاکِ گریباں کو۔

ان کے سارے کپڑے "گو اور موت" میں لت پت تھے اور جمالِ ہمنشین پاس پڑوس پر بھی کافی اثر کر چکا تھا۔

جیسے تیسے مولانا اور ان کی محترمہ پائخانے تک پہنچائی گئیں کوئی دس منٹ تک مولانا اور ان کی محترمہ ان غلاظتوں کو دھوتی رہیں۔ خدا خدا کر کے مولانا اپنی جگہ پر پہونچے کچھ جھینپے ہوئے سے مضطرب۔!

کئی کئی چھوٹے چھوٹے اسٹیشن پاس ہو گئے مولانا برابر لڑکوں کو آئندہ اسٹیشن کے رلئے بہلا رہے تھے اور ان کی محترمہ بدستور پائخانہ کے اندر۔

پائخانہ کے پاس بیٹھے ہوئے کئی مسافروں نے جب پائخانہ کے اندر سے کراہنے کی آوازیں سنیں تو مولانا کو اطلاع دی گئی کہ آپ کے گھر میں آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔ مولانا کے پائخانہ میں داخل ہوتے ہی بچوں کی ماں زیادہ کراہنے لگیں۔ ان کی تکلیف منٹ

منٹ پر بڑھ رہی تھی ـــــ درجہ بھر کے تمام مسافر اپنی اپنی جگہ پر کچھ پریشان و سراسیمہ سے نظر آرہے تھے کہ الٰہی کیا ماجرا ہے خدا جانے بیچاری کو کیا تکلیف ہے۔

پا یخانے سے کراہنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ مولانا کی بھی آوازیں آرہی تھیں۔

"تھوڑی دیر ٹھہرو اسٹیشن آجائے تو کوئی تدبیر کروں۔ اگر یہی صورت تھی تو تم نے پہلے کیوں نہ کہدیا۔ میں لاتا ہی کیوں ایسی ہی حالت میں تم کو۔ بڑی مشکل ہے مصیبت میں جان کردی ہے تم نے، موت بھی نہیں آتی مجھکو اور تم کو"

لمحہ بہ لمحہ کرب واضطراب بڑھتا ہی جارہا تھا کچھ عجیب حالت تھی۔ ماں کی تکلیف سن سن کر بچے الگ رو رہے تھے اور خود مولانا قریب تھا کہ داڑھیں مار مار کر چیخنے لگیں۔ خدا خدا کر کے کراہنے میں کچھ کمی ہوئی۔ مولانا گھبرا کر پاخانہ سے باہر نکل آئے بُری حالت تھی ان کی بغیر پوچھے ہوئے آپ ہی کہنے لگے۔

"عجیب مصیبت ہے صاحب، ولادت ہو گئی ہے ان کے یہاں"

ہم لوگ حیران تھے کہ اب کیا ہوگا۔ سفر کا معاملہ۔ ایسی حالت، خدا ہی رحم کرے۔ مولانا کے بچے بھی پریشان و سراسیمہ تھے۔ اور خود مولانا مبہوت و ساکت کئی منٹ تک یہی کیفیت رہی کہ ٹرین آہستہ آہستہ ایک اسٹیشن کے پہلو میں ٹھہر گئی جا کر۔!!

لڑائی کے بعد

اگر خدا نے چاہا تو انشاء اللہ! لڑائی کے بعد..............؟

بس دو بول "صلّو" کے پڑھوا دوں گی۔ ارے بیوی آج کل لڑائی کے زمانہ میں تو کچھ ہونا بالکل ناممکن ہے ۔ اب تمہیں دیکھ لو کپڑا ہے کہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا۔ ململ اور تنزیب کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ موا کھاروا جو ڈھائی آنے گز بکتا تھا۔ اب آٹھ دس آنے میں بھی نصیب نہیں ۔ مارکین، چھالٹین، بابامول ہے، "آنکھ کا نشہ" "دل کی پیاس"، "تیری میری مرضی" تو اس لڑائی کے زمانہ میں خریدنا سچ پوچھو نہ میرے بس کی بات ہے نہ خرید سکتی ہوں۔ موٹا جھوٹا جو کچھ میسّر ہے گاڑھا گزّی پہنا کر بچّوں کا تن ڈھانک رہی ہوں۔ اس پر بھی یہ حال ہے کہ منّے میاں اللہ رکھے ہر آٹھویں دن ایک پائجامہ ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ باہر ڈیوڑھی کا دروازہ تو تم نے دیکھا ہوگا ۔ اُس میں دو تین لوہے کی کیلیں نکل آئی ہیں۔ آئے دن اُن کا پائجامہ اس میں اُلجھ جاتا ہے۔ روز سیتی ہوں روز پھاڑ ڈالتے ہیں۔ ناک میں دم ہے بس آٹھ دن میں کپڑوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ دُور از حال سڑک کے چیتھڑے لگائے فقیر اچھے اور یہ نہیں اچھے۔ اُدھر مالکِ مکان کا یہ حال کہتے کہتے زبان سوکھی جاتی ہے۔ کہ از برائے خدا اس دروازہ کی مرمت کرا دو! مگر ایک نہیں ۔ ہزار نہیں ۔

مرمت کرانا تو جیسے یہ لوگ جانتے ہی نہیں! گائے پالی! دودھ دوہ لیا۔ نہ چارے سے مطلب نہ پانی سے غرض! بس جہاں پہلی تاریخ آئی۔ جمعرات کے فقیروں کی طرح کھڑے ہیں۔! اللہ بھلا کرے! دلوائیے کرایہ! اگر خدانخواستہ کرایہ میں گھڑی بھر کی بھی دیر ہوگئی تو اللہ دے بندہ لے۔! مکان خالی کرالینے کی دھمکی۔ عذاب میں جان ہے! بہن اوّل تو سو روپلّی کی حقیقت ہی کیا! پھر یہ مہنگائی۔ اللہ ہی سفید پوشی قائم رکھے تو رہے! روپیہ کا تین سیر آٹا ہے وہ بھی خالص گیہوں کا نہیں! دو سیر کی دالیں! چاولوں کی صورت کو ترس گئی۔ اوّل تو اچھے چاول ملتے ہی نہیں اور جو ملتے بھی ہیں تو وہ دو سیر ڈھائی سیر کے! گوشت روپیہ بارہ آنہ میں۔ ترکاریاں اللہ تیری پناہ۔ شکر وہ سیر آدھ سیر سے زیادہ نہیں ملتی! لکڑیاں چولھے میں جائیں۔ گھر کے تمام پلنگ اور کرسیاں جلادیئے۔ آنکھ میں لگانے کو بھی ایندھن میسّر نہیں۔ ایسی نفسی نفسی تو میں نے آجتک دیکھی نہیں! اگر یہ پیٹ کا دھندا نہ ہوتا تو میں اس گھر بار کو آگ لگا کر ان سے کہتی چلو کسی گاؤں میں بس رہیں! جہنم میں جائے یہ آفت پیٹا ہٹلر دُنیا کا سُکھ چین سب کمبخت نے چھین لیا۔ گور میں کیڑے پڑیں اس کے۔ آمین!

میری آنکھوں میں خاک! صلّو کا بیاہ! اللہ میرا جانتا ہے کیا کیا ارمان لئے بیٹھی ہوں اپنی صلّو کو پروان چڑھتے دیکھنے کیلئے! میرا بس چلتا بہن تو میں دُکھیاری ماں ساری دنیا کی دولت سمیٹ کر اپنی بچّی کے قدموں تلے بچھا دیتی! کوئی گہنا۔ کوئی زیور۔ ایسا نہیں تھا جو جہیز میں دینے کیلئے نہ سوچتی ہوں۔ جہانگیری پازیب۔ بازوبند جھُمکے۔ اور راج۔ کنگن۔ کرن پھول۔ چمپا کلی۔ سب سونے کا جڑاؤ دوں گی۔ کپڑوں کے لئے تو یہ طے کر چکی ہوں کہ ایسے ہوں گے کہ دنیا کہہ دیگی

کہ خواجہ صاحب کی پوتی کا بیاہ تھا۔ باقی جہیز کے بارے میں "وہ" ذرا مخالفت کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں جہیز وہیز کا سخت مخالف ہوں۔ یہ سب جہالت کے ڈھکوسلے ہیں۔ جو کچھ دینا ہے نقد لڑکی کے ہاتھ میں دیدو ۔۔۔ خلاف تو وہ زیور گہنے کے بھی تھے۔ مگر میرے بہت سمجھانے بجھانے پر مان گئے۔ آگ لگے موئے اس فیشن کو، جسے دیکھو بے دین اور لامذہب ہوتا چلا جارہا ہے۔ نہ اللہ سے واسطہ نہ رسول سے غرض۔ یہ جہالت ۔۔۔ وہ جہالت ۔۔۔ بڑے بڑے چندے دینا! بائسکوپ اور تھیٹر دیکھنا بس یہی رہ گیا ہے۔ اللہ جانتا ہے جب سے یہ آفت پیٹے اخبار چھپنے لگے جبھی سے یہ نحوست دنیا پر چھاگئی ۔۔۔ روز روز کا بے تکان جھوٹ اللہ ہی ہے جو آسمان نہیں پھٹ پڑتا ۔۔۔ آج فلاں جگہ لڑائی ہوگئی فلاں جگہ جھگڑا ہوگیا۔ آج یہاں بلوہ ہوگیا کل وہاں ۔۔۔ پرسوں گائے کے پیٹ سے ہاتھی کا بچہ پیدا ہوا ۔۔۔ یہ ہوا وہ ہوا۔ تمہیں بتاؤ جب تک یہ اخبار نہیں تھے۔ نہ کانگریس ہوئی نہ لیگ آئی۔ نہ گاندھی پیدا ہوئے نہ جناح ۔۔۔ نہ ہندو مسلمانوں میں جھگڑے ہوئے! سب امن چین سے رہتے تھے۔ نہ کوئی جھگڑا تھا نہ کوئی بکھیڑا۔ اور اب تو سنتے سنتے کان پک گئے ہیں! بھلا تمہیں خیال کرو کہاں ہماری سرکار اور کہاں جرمنی کے کفن کھسوٹ! شیر اور گیدڑ کا کون مقابلہ ۔۔۔ یہ سب اخباروں کا جھوٹ ہے جو کہتے ہیں کہ ہٹلر نے کوئی ملک جیت لیا ہے۔ خدا لگتی تو سچ پوچھو یہی ہے کہ ان موئے جھوٹے سچے اخباروں کو پڑھو ہی نہیں ۔۔۔ سچ کہتی ہوں میں نے تو اُن سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے گھر میں یہ جھوٹے سچے اخبار جو تم لیکر آئے تو بس اچھا نہ ہوگا۔ تم کو اگر جھوٹ سچ پڑھنا ہی ہے تو منحوسیت وہیں باہر رکھو ۔۔۔ مجھے گھن آتی ہے ابھی دو برس کی بات ہے

جب وہ لڑکی پیدا ہوئی تھی ان کے کسی دوست نے اخبار میں مبارکباد چھپوا دی۔ "یہ" بہت خوش خوش گھر میں اخبار لیکر آئے —— پھر کیا ہوا دیکھ لیا تم سب نے! کیسی بھولی بھالی تھی۔ اللہ نے بلالی —— میرا تو کلیجہ لرز جاتا ہے جب دیکھ لیتی ہوں اخبار کو ننھی بچی کی صورت آنکھوں تلے پھرنے لگتی ہے۔

ہاں تو کہہ رہی تھی کہ بس لڑائی ختم ہونے کے بعد ہی ارادہ ہے کہ اس کا نکاح کر دوں پیام تو کئی آئے! لیکن بہن —— تم جانتی ہو کہ یہ زندگی کا ساتھ سابقہ ہے! میں ایسے معاملے میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوں —— آج کل کے لڑکے —— ا توبہ —— توبہ —— میرے سامنے ابھی خود دو پہاڑ ہیں۔ نہ جانے کیا مقدر میں لکھا ہے۔ مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جو جیسا ہوتا ہے ویسا ہی کہلاتا ہے —— مجھ کو تو اس زمانے کے طور طریقے خاک نہیں جچتے! ایک آنکھ نہیں بھاتے! یہ چودھویں صدی نوج لوٹ کر آئے! میاں نے بیوی کا گھونگھٹ اُٹھاتے ہی ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ بائیسکوپ، تھیٹر، سرکس، ہاٹ بازار، کچہری دربار، بندریا کی طرح لئے پھر رہے ہیں۔ نہ پردہ، نہ برقعہ، غیرت و شرم کا نام ہی نہیں! وہی میموں کا ایسا پہناوا۔ اونچی ایڑی کی گورگابیاں —— اُلٹی مانگ —— اللہ جانے اس زمانے میں کیا ہو گیا ہے کہ موئی کسبیوں اور بیویوں میں کوئی فرق نہیں رہا —— ! اے ہے یہ آج کل لڑکے نہیں باپ پیدا ہوتے ہیں۔ باپ کی بوڑھی روڑھی ہڈیوں پر روز روز نت نئے فیشن نکالتے ہیں۔ داڑھی تو اصل خیر سے اس زمانے میں فیشن پر بھینٹ چڑھ ہی چکی ہے۔ ٹھاٹھ باٹھ بھی بالکل عورتوں جیسے بدلتے چلے جا رہے ہیں! میں نے تو ارادہ کر لیا ہے چاہے میری صلوتا بہ زندگی یوں ہی کنواری پڑی رہے۔ مگر کروں گی تو کسی ٹھکانے

کے لڑکے سے، جو حسب نسب، چال چلن، طور طریقوں میں برابر کا ہو، نہ مجھ کو دولت چاہیئے۔ نہ گاؤں گراؤں۔! بس کھاتا پیتا گھر ہو! دال روٹی سے مزے میں ہو۔ لڑکی سُکھ سہاگ سے رہے، میرے لئے یہی سب کچھ ہے۔!

۲

ایشور کی مرضی ہے تو لڑائی کے بعد۔!

گنگا کی قسم کھا کر کہتا ہوں منیم جی۔ لڑائی کے بعد کم سے کم دس ملیں گنے کی ضرور کھول دوں گا۔ یہ لڑائی اور سب طرح سے تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے! اگر ہمیشہ ہوتی رہے تب بھی لالہ کوڑی مل کو کچھ سندیہہ نہ ہوگا۔ فکر ہے تو بس اتنی بات کی کہ لڑائی کی وجہ سے بدیشی مشینیں آنا بالکل بند ہو گئی ہیں۔

چاول آٹے اور تیل کی مشینیں اب اتنی پرانی ہو چکی ہیں کہ روز روز بگڑتی رہتی ہیں۔ اگر ٹھیک ٹھاک سب مشینیں چلتی رہیں تو روزانہ کم سے کم دو من آٹا اور تین سو روپیہ کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ آٹے کی پسائی تو تم دیکھ رہے ہو روزانہ کتنی بڑھتی چلی جا رہی ہے!

اگر کنٹرول والوں کا ڈر نہ ہوتا تو تیس چالیس لاکھ روپیہ کے قریب گیہوں میں فائدہ ہو جاتا۔ جب پندرہ سیر کے قریب گیہوں بکتے تھے۔ میں نے پانچ لاکھ روپیہ کا سودا کیا تھا جس کی قیمت اب آٹھ گنی ہو چکی ہے اور اگر مہنگائی کا یہی حال رہا تو ایشور چاہیگا پچاس لاکھ روپے کا مال ہو جائیگا۔ ذرا خیال رکھنا گھن وں نہ لگ جائے۔!
میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ سولہ اور سوا سولہ آنے پر بھی اگر ملک کا روپیہ ملجائے

تو نہ چھوڑو۔ میں نے سب انتظام کرلیا ہے دو ہی چار دن میں کئی چاندی گلانے والے سُنار آجائیں گے۔ یہ روپیہ گلوا کر ان سب کی چاندی نکلوالو۔ پچھلے سال تم دیکھ چکے ہو ملکہ کی چاندی کا بھاؤ کتنا بڑھ گیا تھا۔ یہی حال رہا تو ملکہ کی چاندی دونے بھاؤ چڑھ جائیگی۔

اب کی سمت بدلتے ہی سب پُرانے کھاتے بدلکر نئے بنا ڈالنا۔ لاکھ دو لاکھ سے زیادہ کی جمع خرچ نہ دکھانا۔ یہ روز روز کے ٹیکس اور لڑائی کے چندے کہاں سے دیئے جائیں گے۔ اس دن ڈپٹی صاحب نے بُلوا بھیجا تھا۔ پچاس مانگ رہے تھے پچاس۔ تم ہی بتاؤ اگر لالہ کوڑی مل پچاس پچاس روپیہ چندہ دینے لگے تو لڑائی سے پہلے ہی دیوالہ نکل جائیگا۔ میونسپلٹی کے چیرمین آئے تھے اس دن! کہتے تھے کہ کلکتہ میں قحط پڑ گیا ہے سیٹھ۔ سب لوگ فاقوں مر رہے ہیں کچھ مدد کرو۔ چندہ دو۔! میں نے کہا میرے پاس کیا دھرا ہے جو کلکتے اور بمبئی مدد کرنے جاؤں۔ میرے دروازہ پر خود ایک چھوڑ دو گائیں بندھی ہوئی ہیں انہیں کا چارہ پانی مشکل ہے۔ تم لوگوں کو چندوں کی پڑی ہے۔ نجانے کتنے جہاز روزمرہ سرکار غلّے کے بھیج رہی ہے۔ اور کلکتے والے ہیں کہ بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور پھر اگر ان کی اسی بہانے لکھی ہے تو کیا چندوں سے موت کی گھڑی ٹل جائیگی۔؟

چندہ، چندہ، چندہ۔! جدھر دیکھو یہی سُنائی دیتا ہے جیسے سیٹھ کوڑی مل نے دنیا کی "سنتھاؤں" کا ٹھیکہ ہی لے رکھا ہے۔ شہر بھر کے تمام گئوشالے، دھرم شالے۔ اناتھالے۔ پاٹھ شالے سبھی میں تو چار چار آنے ماہوار چندہ دینا پڑتا ہے۔ پھر آخر اپنا بھی کوئی دین دھرم ہے۔ پوجا پاٹ، ستنارائن کی کتھا۔

ایکادشی کے برت، نیم جی سب کچھ کرتا ہوں ۔ اب بھی اگر ، نرکھ میں جانا میرے بھاگ ہی میں لکھا ہے تو اس کو میں کیا کروں ۔

ہاں ۔ ! سنتے ہو ریزگاریوں کا بھاؤ روز بروز چڑھتا چلا جا رہا ہے ۔ اب ایک روپیہ کی دس آنے ہو گئی ہے ۔ ذرا ہاتھ روک کر کام کرنے کی ضرورت ہے بھگوان نے چاہا تو چند دنوں میں گھٹ گھٹا کر آٹھ آنے تک آیا چاہتا ہے بنک کے بابو سے مل کر ذرا بات چیت کرو ۔ اگر وہ پچاس ہزار روپیہ کی ریزگاریاں دلوا دیں تو نقد پچاس روپیہ دوں گا ۔ کوشش کرو شاید آ جائے رکھے پر ۔!

مونگ پھلی کے مل والے آجکل بہت ہلڑ مچا رہے ہیں کہتے ہیں یا تو مہنگائی کا بھتہ دو یا پھر تنخواہ بڑھاؤ ۔ میں نے تو صاف صاف کہدیا کہ یہ سب کچھ آجکل لڑائی کے زمانہ میں ہونا مشکل ہے ۔ محنت کرو اور جان توڑ کوشش کرو تو لڑائی کے بعد اکنّی روپیہ کے حساب سے تنخواہ بڑھا دوں گا ۔ ہونہہ یہ سب سمجھتے ہیں کہ اگر ہم لوگ کام چھوڑ کر چلے جائیں گے یا ہڑتال کر دیں گے تو مالک کو آدمی نہیں ملیں گے ! یہ جانتے نہیں کہ اگر سیٹھ گوڑی مل بڑے لاٹ صاحب کو سلام بول دیگا تو گرانچیوں میں بھر کر آدمی کلکتے سے آ جائیں گے ۔ بیچارے بھوکوں مر رہے ہیں ! کھانے کپڑے پر یہ سودا کچھ مہنگا نہ ہوگا ۔ پھر اپنے یہاں تو بابا اور دادا کے وقت سے " سدابرت " جاری ہے ابھی اُس دن پانچ سادھوؤں کو پاؤ پاؤ بھر آٹا میں نے دلوایا تھا یہی کیا کم ہے پاؤ بھر آٹا آج کل دو آنے کا ملتا ہے پانچ دونا دس آنے اسی طرح ہو گئے ۔ سال بھر میں ایسے ایسے دس پانچ خرچے ہو جاتے ہیں ۔ غریبوں کی بھلائی سے بھگوان بھی خوش ہوتے ہیں ۔ قحط پڑ گیا ہے بیچارے تکلیف میں ہیں میرا کام کریں گے اور مرنے

سے کھائیں گے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو تو بھی مجھے کیا کمی ہے! پندرہ ہزار سے کچھ زیادہ ہی اسامی ہیں۔ اتنی روپیہ سود پر میں نے سب کو روپیہ دیا ہے غریبوں پر دیا کرنا ہی پڑتی ہے کیا کروں بیچارے بھوکوں مر رہے تھے دین دھرم سمجھ کر اتنی روپیہ سود ہی پر دے دیا۔ ورنہ بیاج تو آج کل بہت ہے ــــ اگر میں ان لوگوں سے کہہ دوں کہ بھائیو! ایک ایک مہینہ میری مل پر کام کر دو میں سود چھوڑ دوں گا۔ تو رام جانے ایسی ایسی پانچ ملیں اور کھول دوں ــ تب بھی آدمیوں کا ٹوٹا نہ ہو! چھوٹے منیم جی! مجھے تمہارا بڑا خیال ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے تم کو یہی سوچ کر دس روپے مہینہ پر نوکر رکھا تھا کہ روز روز کی تنخواہ گھٹانے بڑھانے کا جھنجھٹ ہی نہ رہے۔ ورنہ یوں تو آٹھ روپیہ پر بھی آدمی مل رہا تھا۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ ستارے بار بار ہنگارو ــ ایک بار۔ یہی خیال کر کے میں نے ایک دم سے دس روپیہ مقرر کر دیئے تھے۔ کہ آئے دن کا جھگڑا نہ رہے۔ تم خود دیکھ رہے ہو آج کل دنیا بھر کے روزگار ٹھپ پڑے ہوئے ہیں۔ سوائے گھاٹے کے نفع کا نام ہی نہیں۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ سونا چھوتے ہی تو مٹی ہو جاتا ہے ــ کھانے پینے سے الگ تکلیف ــ ایندھن ملتا ہی نہیں۔ مصیبت میں جان ہے۔ تم کہتے ہو تنخواہ بڑھاؤ ــ میں خود اپنے دکھ میں پھنسا ہوا ہوں ــ تم کو اپنی پڑی ہے۔ محنت کرو ــ بھگوان کی اچھیا ہے تو لڑائی کے بعد کچھ تنخواہ ضرور بڑھاؤں گا۔

ــــ ٭ ــــ

ہچکولے

بیشک اگر احسان کا بدلہ نقصان ہی ہے تو میں نے سچ مچ یہ بہت بُرا کیا جو اپنے کوٹھے کا دروازہ نیچے کرایہ داروں کے پانی لینے کیلئے کھول رکھا تھا۔ کیوں کہ قریب میں میرے کوٹھے پر نل کے علاوہ اور کہیں آسانی سے پانی نہیں مل سکتا تھا۔ پھر میرا ہرج ہی کیا اگر زینے کا دروازہ بند بھی نہ کروں تو بھی میرے کمرہ کا تمام سامان حفاظت ہی سے رہتا۔

میری منہمک زندگی۔ مختصر سی ضرورتیں۔ خاموش اور پُرسکون تنہائی۔ مجھے اس کا موقع ہی کب تھا جو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ نیچے گلی کی کوٹھریوں میں کتنے کرایہ دار ہیں آج کل ۔۔۔ کیا نام ہیں ان کے ۔۔۔ سڑکوں پر تانگوں اور موٹروں کی رفتار دھیمی کر دینے والے کتنے میلے کچیلے بچے انہوں نے پیدا کئے ۔۔۔ یہ لوگ کیا کرتے ہیں ۔۔۔ ان کی تنخواہیں کیا ہیں وغیرہ وغیرہ ۔۔۔؟

سویرے اُٹھنا منہ ہاتھ دھو کر چار پینے کے لئے ہوٹل جانا ۔۔۔ پھر کھانا ۔۔۔ اور کالج ۔۔۔ سہ پہر کو ٹہلنا، کھانا ۔۔۔ پینا ۔۔۔ کچھ پڑھنا۔ اور سو رہنا۔ بقولِ منظور صاحب کے میری زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ

پڑھتے پڑھتے "جبرئیل" ہو جاؤں۔
کبھی کبھار چھٹی کے دن جب کہیں "اسٹیڈی" کیلئے نہ جاتا تو بھی میرا کمرہ تمام دن اندر سے بند ہی رہتا — کیونکہ کمرہ کے باہر مختصر سے صحن میں برتنوں کے مانجھنے کی پیہم کھڑکھڑاہٹ — بیدری کے ساتھ نل سے بہتے ہوئے پانی کی شرشراہٹ — اور پھر نیچے رہنے والی عورتوں کی بے جوڑ اور گندی باتیں — میرا دماغ پکا دیتیں —

"سوکھی لکڑی جلتی ہی نہیں" — ؟

"مرلی کی بوا — کیا پکایا آج"

"جانے رامو کی بہو کے لڑکا کب ہو گا — دن تو پورے ہو چکے"

"دو دن سے بمبا جلدی ہی بند ہو جاتا ہے"

"یہ بابو بھیتر سے کمرہ کیوں بند کر لیتے ہیں — نہ جانے کیا بات"

"تو نے سُنا — ری — بھوجی — گنگا کی دُلھن بھاگ گئی — اس ڈرائیور کے سنگ"

"اسپتال میں بھرتی ہو جاؤ —"

"پنجاب میں بھیج دیگا — چھی — نا — کو"

"دیکھ — تیرے ڈھور نے کیسا مارا ہے — میرے شیامو کو"

"بمبے کا جی چھوڑ — چل — ہٹ"

"کیا کوئی چھٹی نہیں آئی —"

"چہ — چہ — چہ — لام پر چلا گیا دکھیا ؟"

میرے کوٹھے کے صحن پر اکثر اسی قسم کے معاملات چھڑے رہتے۔ یہ گندی قسم کی غلیظ اور بے ہنگم کثیف عورتیں زیادہ تر میرے کوٹھے کو۔ ارہر کے کھیت" اور "پنگھٹ" کی ان رومانٹک ضروریات کے طور پر استعمال کرتیں جو اکثر اسی قسم کی باتوں کیلئے مخصوص ہوئے ہیں اور جن کو ان لوگوں کا "دار العوام" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اور میں نے آجتک کبھی بھی ان کے اس تکلیف دہ آرام میں کوئی مزاحمت یا دخل اندازی نہیں کی۔ حالانکہ مکان کا مالک ہر مہینے مکان خالی کرا لینے کی دھمکیاں ہی دیا کرتا۔

"صاب — سارا دن آپ کا بمبا — بند ہی نہیں ہوتا۔ چھت پھٹی پڑتی ہے!"

"آپ اپنا دوسرا انتظام کر لیجئے — مجھے خود مکان کی ضرورت ہے"

"نیچے زینے میں قفل کیوں نہیں لگا دیتے!"

"تو میں کیا کروں — آپ پانی نہ لینے دیجئے"

"جناب روز — روز — نل کی مرمت نہیں ہو سکتی"

میں سخت عاجز تھا کہ مالکِ مکان کو کس طرح سمجھاؤں کہ پانی جیسی کم قیمت چیز بند کرنیوالا "یزید" ہو جایا کرتا ہے — آپ نے نیچے کرایہ دار تو ٹھہرا رکھے ہیں — لیکن ان کے پانی کا کوئی انتظام نہیں کیا — صرف کرایہ ہی لینا جانتے ہیں آپ چاہے مجھے گھر خالی کر دینا پڑے — مگر قفل لگا کر پانی بند کر دینا میرے بس کی بات نہیں —

ان سب باتوں کے باوجود کبھی کبھی نرمی سے سمجھانا بھی پڑتا۔

"دیکھو تم لوگوں نے نل کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اگر زیادہ گڑبڑ

کرو گی تو جانتی ہو مجبوراً مجھکو زینہ میں قفل لگانا پڑے گا۔ سُن لیا تم سب نے۔
سب عورتیں اپنی اپنی صفائی دینے لگیں ــــ جیسے یہ سب کچھ ان لوگوں کا کیا دھرا نہیں ہے۔

"نا ــــ بابو ــــ نا ــــ میں نے کبھی بمبا خراب نہیں کیا ــــ وہ جو آتی ہے ــــ راجہ کی ماں اس کا سب قصور ہے۔"

"ہاں ــــ وہی تو بمبا کھلا چھوڑ جاتی ہے۔"

"اور مالن کے لڑکے بھی تو سارا دن پانی سے کھیلا کرتے ہیں ــــ"

ــــ نا بھوجی۔"

"سرجو کی بہن نے تو اس دن بمبے کا پیچ نکال ڈالا تھا۔"

"ہاں ــــ بابو ــــ وہ رانی تو اس دن اس کوٹھڑی میں نہائی ہے۔"

غسلخانے کی طرف اشارہ کر کے ایک عورت نے کہا سچ مچ میرے غسلخانے میں بھی غلاظتیں دھوئی جاتی ہیں۔ میرے تن بدن میں چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اللہ کی شان ــــ اب میرا غسلخانہ ان بدڈھنگی ــــ گندی ــــ اور غلیظ عورتوں کیلئے ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً ہی اس منحوس اور گندے گھر کو آگ لگا دوں ــــ اور اس غسلخانے کی اینٹ اینٹ کھود کر پھینکدوں۔ ہر مہینے کرایہ دے کر باتیں میں سنوں ــــ اور غسلخانے میں نہ جانے کس قسم کی غلیظ اور گندی کثافتیں دھوئی جائیں ــــ گویا میرا گھر نہ ہوا بھٹیاروں کی سرا ٹھہرا ــــ زمانے بھر کی آلائشیں ــــ دنیا بھر کے روگ ــــ گندگی ــــ میرا جی متلانے لگا ــــ

میرے کہنے سُننے کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ دو چار روز نل کچھ احتیاط سے استعمال کیا گیا۔ برتن دھیرے دھیرے مانجھے گئے۔ باتیں آہستہ آہستہ ہوئیں۔ اور پلا دروازے کا غسلخانہ صاف ستھرا رہا۔ لیکن ہفتہ ہی بھر کے بعد یکایک یہ معلوم ہوا جیسے میرے خلاف سخت "ایجی ٹیشن" یا "ستیہ گرہ" شروع کر دی گئی ہے ——— پھر وہی رفتار۔ نہایت باقاعدہ طریقہ پہ بے احتیاطی کیساتھ نل کی پوری دھار چھت کی چٹان سے ٹکرانے لگی۔ برتنوں کے دھیرے مانجھنے کے علاوہ شکست و ریخت کی مرمت بھی ہونا شروع ہو گئی۔ نہایت ہی میلی کچیلی ساریاں ——— اور غلیظ دھبوں میں ڈوبی ہوئی دھوتیاں ——— بدو غلیظ کرتیاں اور شلوکے ——— اور نہ جانے کس کس قسم کے انوکھے کپڑے میری الگنی پہ پھیلائے جانے لگے ——— اور ——— اور ——— غسلخانہ تو اچھا خاصا ستیاناس کیا جانے لگا ——— کہ خدا کی پناہ ———!

کپڑے دھونے کا صابن ——— سجی ——— سر ملنے والی مٹی ——— اور نہ جانے کہاں کہاں کے بال ——— خدا جانے ——— کس کس قسم کی نرالی بدبودار دوائیں ——— اور خاک بلا سبھی کچھ غسلخانے میں جمع ہونے لگا۔ خدا جانے غسل بھی کس کس طرح سے کئے جاتے کہ ——— فرش کے علاوہ غسل خانے کی تمام دیواریں۔ ——— بلکہ چھت تک پانی کی چھینٹیں اڑ کر پہنچ جاتیں ——— مگر یہ سب کچھ اس وقت ہوتا۔ جب میں کالج میں اپنی قسمت کو رو رہا ہوتا ———!

دماغ غصے پکتے پکتے پھوڑا بن چکا تھا۔ خاک میری سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کروں۔ اس قسم کی باتوں کی روک تھام ہو سکے ——— زینے پہ قفل لگا کر پانی بند کرنا۔

میں چاہتا نہ تھا — لڑائی کی وجہ سے اوّل تو مکان مہنگے بھی بہت تھے۔ دوسرے ملتے ہی نہ تھے — پھر ایسے موقع کے مکان! بازار بھی قریب! ہوٹل بھی نزدیک! اور پھر کالج بھی دُور نہیں — عجب مخمصہ میں جان تھی۔

اِدھر نیچے کی کرایہ دار عورتیں تھیں کہ میرے ساتھ بہت ہی "سوشل" ہو جانے پر تلی ہوئی —

"لڑائی میں کیا ہوا نہ جانے"

"تمھارا مکان کہاں ہے بابو — جی"

"ذرا بابو — یہ خط — پڑھ دینا"

"جانے یہ مہنگائی کب ختم ہوگی"

"بیاہ نہیں ہوا — ابھی تمھارا"

"بیچارے بڑے ہی اچھّے ہیں بابو"

"ایک دوّنی کے پیسے تو نہ ہوں گے — تمھارے پاس"

"وکیلیت (وکالت) پڑھ رہے — آپ نا — ؟"

"ایک چٹھی لکھ دو — ننھّی کا ابّا — لام پر چلا گیا ہے۔

"ذرا ماچس دے دو"

میں سخت عاجز تھا کہ یا اللہ یہاں ہیضہ بھی نہیں چلتا۔ کمبخت ملیریا اور ٹائیفائڈ بھی ڈرتا ہے ان لوگوں سے — نجانے گردن توڑ بخار — اور پلیگ آج کل کہاں مر گئے ہیں — دنیا کے تمام ڈاکٹر جھوٹے ہیں — جو کہتے ہیں گندگی اور غلاظت سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں — بالکل غلط یہاں تو دنیا بھر کی بیماریاں

خود سسکیاں لیکر ختم ہو جاتی ہیں ــــ اور یہ سب مر کیوں نہیں جاتیں جو پیچھا چھوٹ جاتا ــــ میرا ــــ اللہ کرے زلزلہ ہی آ جائے کہیں کوئٹہ کی طرح ــــ اور یہ مکان ــــ یہ تمام کوٹھڑیاں ــــ سب کچھ ڈھیر ہو جائیں ــــ

ایک طرف تو میں ان سب کے مر جانے کی دعا مانگ رہا تھا دوسری جانب انہیں میں ایک نہایت مکروہ صورت بڑھیا ــــ روزانہ کالج جاتے وقت اور واپسی پر طرح طرح سے آنکھیں چمکا کر ــــ بُری طرح کولھے مٹکا کر ــــ عجیب عجیب قسم کے اشارے کر کے مجھ پر "عاشق" ہو جانے کی کوشش کر رہی تھی ــــ روزانہ میرے زینے سے اُترتے ہی ــــ اپنی میلی کچیلی ساری ــــ اپنے بالکل ہموار سینہ سے ڈھلکا کر ــــ انگڑائیاں لیتی ــــ بڑے زور زور سے کھانستی ــــ کھنکھارتی ــــ ٹھنڈی سانسیں بھرتی ــــ اپنی بے ہنگم اور بیڈول پنڈلیوں کو کھول کر ــــ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے گھورنے لگتی ــــ اور مسکرانے ــــ!

"کیا اسکول جا رہے ہو ــــ بابو ــــ؟"

"ایک آنہ پیسہ ہو تو دیدو ــــ!

"نجانے ــــ کیوں ــــ کمر میں ــــ درد ہو رہا ہے آج ــــ"

"کل اتوار ہے ــــ نا ــــ؟"

مجھے اس کی ان فضول اور بیہودہ حرکتوں پر رہ رہ کر بہت ہی غصہ آتا ــــ اور میں بلا کوئی جواب دیئے ہوئے نفرت سے منہ پھیر لیتا ــــ!

پانی بند کر دینے اور قفل لگا دینے کا مسئلہ ابھی تک زیر غور ہی تھا ــــ کہ ایک

کالج سے مجھے دوپہر کو ہی واپس آنا پڑا ۔۔۔۔ شاید اسٹرائیک ہو رہی تھی ۔۔ میں جو گھر پہنچتا ہوں تو میرا غسلخانہ پانی کے نل کی بے پناہ آوازوں سے گونج رہا تھا۔ میرے غصّے کی انتہا نہ رہی ۔۔۔ میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ اپنے ہی غسلخانہ میں سہی مجھے اس طرح پروانہ چلے جلنے کا کیا حق حاصل تھا۔

"سچ مچ میں سکتے میں رہ گیا۔"

ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ اپنے دونوں پاؤں جوڑ کر اوکڑونی بیٹھ گئی

اس کے سارے بدن پر کپڑے کا ایک تار بھی نہ تھا ۔۔۔ بکھرے ہوئے گھنیرے بالوں سے پانی اس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے زور زور سے مینہ برس رہا ہو۔

"بابو ۔۔۔ اب کبھی نہ آؤں گی ۔۔۔ نہانے کیلئے۔"

اس نے آنکھیں جھکائے ہوئے کہا!

آج پہلی مرتبہ ایسا معلوم ہوا جیسے کثافتوں میں نور جگمگا اٹھا!

بالکل کمسن! گورے چٹے رنگ کی دُبلی پتلی لڑکی ۔۔۔

کیا ایسے گندے اور کثیف ماحول میں یہ خوبصورتی بھی ہو سکتی ہے!

میرا دل دھڑکنے لگا۔"

"مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ تو ۔۔۔! میں نے پوچھا"

"میں ۔۔۔ رانی ۔۔۔ ہوں! پرشادی بھیّا کی بہن ۔۔۔ وہ بولی۔!

"رانی" میں نے سوچا وہ سچ مچ "رانی" ہی تھی ۔۔۔ میں جلدی سے غسل خانے سے باہر نکل آیا۔

"تو نہائے ۔۔۔ خوب! میں خفا نہ ہوں گا۔"

نجانے کس طرح الٹا سیدھا پانی بہا کر جلدی سے وہ باہر نکل آئی —
اس کا چہرہ شرم و ندامت سے عرق عرق ہو رہا تھا — اور منہ زور زور سے
اچھل رہا تھا —!

"تو روز نہا — جایا کر — آکر" میں نے خود اسے دعوت دی۔
"نا — بابو — اب کبھی ایسی خطا نہ ہوگی!" وہ کہنے لگی۔
"نہیں — نہیں — میں خفا نہیں ہوں — رانی!
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جلدی جلدی وہ زینے سے نیچے
اتر گئی —!

آج اتنے دنوں میں پہلی بار میرا دل کثافتوں کی طرف کھنچتا ہوا محسوس ہوا
گلی کی بدبودار گندی کوٹھڑی میں تخیل کی ایک بے پناہ جنت رقصاں نظر آنے
لگی — میرے سارے کوٹھے کی جگمگاہٹ اور رونق آج سمٹ کر اسی گندے
غسلخانے میں سما گئی تھی۔ جہاں کی بدبودار ہوائیں ہوش و حواس کو پراگندہ کر دینے
میں اب تک اپنی مثال آپ تھیں — اور — اور — آج — رہ — رہ کر
میرا دل چاہتا تھا کہ نیچے کی تمام کرایہ دار عورتیں — وہی گندی میلی کچیلی عورتیں —
نہایت غلیظ اور کثیف عورتیں! سب میرے کوٹھے پر برتن مانجھنے آجاتیں —
اپنی میلی میلی ساریاں اور گندے کپڑے پھیلا دیتیں! کھل کھول دیتیں — اور اتنا پانی
بہاتیں کہ میرا کوٹھا سیلاب میں بہہ جاتا — وہ سب بہت ہی بے تکی اور
بے تکی! اور بے جوڑ باتیں کرتیں — میرا غسلخانہ آج اتنا ستیاناس کیا جاتا —
اور ان سب کے ساتھ "رانی" بھی ہوتی —!

ہفتہ بھر میں کئی مرتبہ میں وقت بدل بدل کر کالج سے ناوقت واپس آ گیا لیکن ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے غسلخانے کا آہنی نل زور زور سے پانی بہا رہا ہو۔ کئی بار میں غسل خانے کے اندر تک چلا گیا لیکن وہاں کوئی نہ تھا! مجھے نیچے بھی رانی نظر نہ آئی —! جانے کہاں رہتی ہے وہ —؟ یہ پرشادی کون ہے؟ کیا کرتا ہے —؟ کس نمبر کی کوٹھری میں رہتا ہے —! مجھے آج تک معلوم نہ تھا — اتنے دنوں میں کبھی میں نے ان لوگوں کی بابت کسی سے کچھ بھی نہیں پوچھا — اب کیسے پوچھوں۔ کس سے — اور کیا پوچھوں —؟

اتوار کے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا — دل کی دھڑکنوں کا شمار کر رہا تھا کہ پوسٹ کارڈ ہاتھ میں لئے ہوئے وہ آ گئی — گہرے رنگ کی سیاہ ساری سے اس کا بلوریں جسم بالکل اس طرح چمک رہا تھا۔ جیسے کالے بادلوں میں سے جھانک رہا ہو۔

میں بے اختیار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"را — نی"

"بابو — ذرا یہ خط پڑھ دو" اس نے پوسٹ کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔!

"کہاں سے آیا" نہائیت گھبرایا ہوا لغو سوال میں نے کیا۔

"جانے کہاں سے" آنکھیں گھماتی ہوئی بولی — "شاید چیچا نے بنارس سے بھیجا ہو گا —!"

میں نے اپنے سوال کی مہملیت پر شرمندہ ہو کر سارا خط زور زور سے

پڑھ کر سُناتے ہوئے پوچھا ۔!

"جواب لِکھ دوں ـــــ رانی ، ـــــ اب تم نہانے نہیں آتیں ـــــ کیا بات ہے ـــــ؟"

"بات تو کچھ نہیں ـــــ وہ برابر نگاہیں نیچے کئے رہی ـــــ ماتا جی ! بیمار ہیں ـــــ"

"کہاں ـــــ کیسے ـــــ کب ـــــ میں سب کچھ جلدی جلدی پوچھ لینا چاہتا تھا ـــــ"

"بخار ہو گیا تھا ـــ اب کھانسی بھی آنے لگی " وہ بولی

" دوا نہیں پلائی " میں نے ہمدردی کے لہجہ میں کہا ۔

"ہاں دوائی اسپتال سے لائی تھی ـــــ پہ ـــــ فائدہ نہ ہوا ـــ اس نے جواب دیا ، اچھا اب جاتی ہوں ـــــ!

اس نے چلنے کیلئے قدم اُٹھایا ہی تھا میں نے پوچھا ـــــ

"جواب ـــــ جواب نہیں لکھواؤ گی ـــ؟

"ماتا جی سے پوچھ آؤں"

"اس کے قدم بڑھتے ہی رہے "

"مجھے انتظار کرتے تھوڑی ہی دیر لگی تھی کہ وہ لوٹ آئی ـــ"

"ماتا جی کہتی ہیں ـــــ لکھدو بابو ـ بڑی دیا ہو گی ـــ!

اس کی نگاہوں سے التجائیں برسنے لگیں ـــــ

" دیا ہو گی ـــــ کیسی دیا ـــــ بیٹھ جا ـــــ رانی ـــــ میں نے پیکے سے

کہا " میرے دل کی رانی " ——!

نہیں —— بابو —— میں مرے —— میں ..... !

میں نے زبردستی شانے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا ——

" رانی "

چٹھی —— لکھدو —— بابو۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ لکھدو۔ ماتا جی کو بخار ہے —— اور پرشادی بھیّا کی نوکری بڑھ گئی ہے! —— اور —— اور —— پرنام —— اور —— اپنی خبر لکھو —— سُندری کا کیا حال ہے —— اور —— سب راضی خوشی —— سب کو رام رام —— متھرا کی ماں —— جاڑے بخار میں مرگئی —— اور سب کو رام رام —— سب راضی خوشی ——

وہ یکایک کہتے کہتے رُک گئی ——

پر —— خط تو ہے نہیں —— ڈاک خانہ بھی بند ہوگا ——

میں نے کہا۔

گھبراتی —— کیوں ہے —— سب ہو جائے گا!

میں نے جلدی جلدی میز کی دراز سے پوسٹ کارڈ نکال کر لکھنا شروع کردیا ——!

اور کیا لکھدوں ——؟

اور —— اور —— جو جی میں آئے لکھدو!

اپنی ساری کے پلّوسے کھیلتی ہوئی وہ بولی۔

مجھے تو اُس کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ وہ بھی جھینپ کر مسکرا اُٹھی۔

میں نے دو چار رسمی باتیں بڑھا کر پوسٹ کا سادہ حصّہ بھی سیاہ کر دیا۔

"لکھوائی"۔۔۔۔۔ دو ۔۔۔۔ رانی!

"لکھوائی"۔۔۔۔۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی!

"ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ لکھوائی ۔۔۔ یہ خط جو لکھا ہے میں نے اس کی لکھوائی مانگ رہا ہوں" میں نے کہا۔

"مگر" وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی ۔۔۔۔ میرے پاس کچھ نہیں بابو ۔۔۔!

میں نے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ "لیکن لکھوائی تو دینا ہی ہوگی"

"ماتا جی دیں گی! وہ بولی کتنے پیسے ہوئے"

اس کے چہرے کا اضطراب و پریشانی پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اگر اسے پہلے معلوم ہوتا کہ لکھوائی کے پیسے بھی دینا پڑیں گے تو وہ خط نہ لکھواتی۔

اس کی پُر اضطراب سادگی مقناطیس کی طرح مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بھولے پن اور سادگی پر میرا دل بیقرار ہو گیا ۔۔۔ میرا دھڑکتا ہوا دل اس کے اُبھرے ہوئے سینے کے مدوجزر میں ہچکولے لینے کیلئے بڑھتا چلا گیا ۔۔۔ اور ۔۔۔ میرے لب اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کے قریب پہنچ گئے۔

"رانی"

دروازہ کی آڑ سے سامنے آکر وہ پکاری"

وہی بدشکل بڑھیا ۔۔۔ جو مجھ پر ریجھی ہوئی تھی ۔۔۔ بجلی کی طرح کوند

کر رانی کمرہ سے باہر اور زینے پر! میں سکتے میں جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا بڑھیا کا یہ المنظر بڑھیا — اب وہیں کھڑی تھی جہاں پر رانی میرے دل کی رانی تھی! بڑھیا کے پچکے ہوئے گال — ریس کورس کے میدان جیسا چپٹل سینہ میرے دھڑکتے ہوئے دل کے مدّ و جزر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ بد رونق — اور — دھنسی ہوئی آنکھیں — چمک رہی تھیں اس کی — وہ مسکرا رہی تھی!

"بابو میں — کسی سے کہوں گی — نہیں"

"دیگر احوال یہ ہے"

ابھی شاہجہان پور پہنچے ہوئے مجھے ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ نہایت ہی معتبر ذرایع سے معلوم ہوا کہ اِس دارِ فانی میں میرے ایک بالکل قریبی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھ لیجئے حقیقی رشتہ دار موجود ہیں۔ یعنی کہ میری جنت آرام گاہ بیوی کے سگے "نانا زاد" ——— خالو ابّا ——— میں ابھی علم الانساب" کی اس مہلک گتھی میں اُلجھا ہوا سوچ ہی رہا تھا کہ الٰہی ان "بیوی زاد" رشتہ داروں کی قلمی اور تخمی کتنی قسمیں ہوتی ہیں ——— اور آیا جراثیم و وٹامن کی طرح ان کی تقسیم بھی "اے" سے لیکر "زیڈ" تک کی جاسکتی ہے۔ یا نہیں کہ ناگہاں میاں خیر اللہ میرے آقائے نامدار نے آکر اطلاع دی ———!

ایک صاحب ——— صاحب ——— آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مولوی عبد المنّان صاحب ——!

میں نے سوچا ——— ایک صاحب ——— اور وہ ——— بھی ——— مولوی ——— پھر عبد المنان ——— خداوندا یہ ماجرا کیا ہے حقیقتاً میں ان "مولویوں" سے ایسا ہی لرزتا ہوں جیسے قصائی سے وہ بڑا جانور ——— جس پر اکثر بقر عید کے دن ہندو مسلمانوں میں نہایت فراخدلی کیساتھ گشت و خون

ہو جایا کرتا ہے ـــ!

مولوی ـــ وہ چاہے کسی درجہ کا کیوں نہ ہو ـــ بہر حال مولوی پھر مولوی ہی ہوتا ہے ـــ یہ اور بات ہے کہ ذرا "ہز ہولی نس" قسم کے مولوی زیادہ دلفریب و جاذب نظر ہوتے ہیں ـــ اور کم از کم براہ راست اللہ میاں کو "رنگ" کر لیتے ہیں ـــ ان کے قبضہ میں جو جنتیں ہوتی ہیں وہ اعلیٰ قسم کی ـــ جیسے ہندوستانی ریلوں کے فرسٹ کلاس "کمپارٹمنٹ" یعنی جتنا گڑ ڈالئے اتنا ہی میٹھا ہوگا ـــ اس لئے چھوٹے درجہ کے مولوی ـــ ذرا چھوٹے درجہ کی جنت "دے سکتے ہیں ـــ بہر حال میں یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ـــ کہاتے ہیں "سلام علیک" کی آواز گونج اٹھی ـــ!

میں نے "وعلیکم السلام" کی ذمہ واریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے عرض کیا ـــ!

تشریف رکھیے ـــ کیسے زحمت فرمائی جناب نے ـــ!

کمرے کو چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولے ـــ!

جی ـــ جی ـــ مجھے صدیقی صاحب سے ملنا ہے ـــ!

میں نے ادب سے کہا۔

میں ـــ حاضر ہوں ـــ فرمایئے ـــ؟

آہا ـــ ہا ـــ حیرت سے صوفوں کے گدوں میں دھنستے ہوئے بولے ـــ آپ ہی ہیں ـــ جی بہت خوب ـــ آپ نے مجھے پہچانا۔ نہیں ـــ ہا خوب ـــ"

جلدی سے لپک کر میرے ہاتھوں میں پنجہ لڑانے کے انداز سے چمٹ پڑے ——!

کمال کیا —— تم نے —— ارے بھئی تم تو میرے بہت ہی قریبی عزیز ہو! میرے گھر میں خدا بخشے تمہاری پہلی بیوی کی خالہ ہوتی ہیں —— بس یوں سمجھو کہ تمہاری ،، ننھیا ساس ،، اور میری خوشدامن صاحبہ مرحومہ، خدا مغفرت کرے —— ان سب کے آباؤ اجداد خلد آشیاں غازی سلطان محمود غزنوی کفر شکن رحمتہ اللہ علیہ کے پہلے حملہ میں عرب سے ایک ساتھ آئے تھے —— اور ان سب میں بہت ہی میل و محبت —— اخلاص و یکجہتی —— آپس داری و مروت تھی —

چہ —— چہ —— چہ —— کیا لوگ تھے —— کیا زمانہ تھا —— اب دیکھ لیجئے —— ایک دوسرے کو کھائے جاتا ہے —— نگلے جاتا ہے —— حسد —— کفر —— الحاد —— بے دینی —— شرک —— بے مروتی —— کج خلقی —— میں تم سے کیا کہوں —— دنیا کا کیا حال ہوتا چلا جا رہا ہے ——!!

مولوی صاحب سلسلۂ وعظ کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ جاری رکھنا چاہتے تھے —— مگر میری طبیعت اُلجھ رہی تھی۔ میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا ——

،، بڑی خوشی ہوئی جناب سے مل کر —— دولت خانہ نہیں ہے نا ——؟

یہی تو کہہ رہا تھا میں —— پھر ارشاد ہونے لگا ۔ ،، میاں برادرانِ

یوسف کی چیرہ دستیوں نے مجھے بے گھر کردیا ــــ اب کوئی پندرہ سال سے تو یہیں ہوں ــــ مگر تمہاری خالہ جان البتہ وہیں مرادآباد میں ہیں اور نورچشمی فہمیدہ سلمہا بھی ــــ بڑی اچھی لڑکی ہے ــــ اب میں کیا بیان کردوں تم سے ــــ!

کلام پاک ــــ اردو فارسی ــــ سب کا تکملہ کرچکی ہے ــ زمانے کی حالت دیکھتے ہوئے ــــ میں کہتا ہوں تم سے کیا پردہ ــــ لڑکیوں سے انگریزی سکول میں بھرتی کرادیا ہے ــــ حالانکہ سچ پوچھو تو میں لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے سخت خلاف ہوں ــــ مگر صرف ان کا خیال ہے وہ کہتی ہیں ــــ اور ٹھیک کہتی ہیں ــــ بڑھاپے کی اولاد سے محبت ہی زیادہ ہوتی ہے ــــ پھر جو اولاد بارہ بچوں میں زندہ بچے اس کی محبت کہاں تک نہ ہوگی ــــ! ہاں تو کہہ یہ رہا تھا کہ مسلمانوں کی اخلاقی پستی کا سبب یہ فرنگیوں کا تمدن ہے ــــ مجھے تو قطعی نفرت ہے اس تعلیم سے ــــ!

قطع کلام ، میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا ــــ!

اور جناب کیا شغل فرماتے ہیں یہاں ـ

میں ــــ مولوی صاحب نے کہا ــــ میں یہاں شاہی مسجد میں ، امام جمعہ والجماعت ہوں ــــ

مختصر یہ کہ مولوی صاحب کافی دیر تک میرا دماغ چاٹتے رہے ـ اسلام کا عروج وزوال ـ مسلمانوں کی بدحالی ـ روزہ نماز ـ چندہ اور

دوزخ — جنگ — تعلیم نسواں — آزادی — شاعری — شاہجہانپور کی مسجدیں — غرضکہ دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر کچھ نہ کچھ سمع خراشی نہ کی گئی ہو —! پھر لطف یہ کہ چلتے وقت آئندہ آنے کے لئے وہ انشاءاللہ کہہ گئے —!

دوسرے دن حسب وعدہ مولوی صاحب پھر تشریف لائے —! کچھ زیادہ شرح و بسط کے ساتھ "مواعظ حسنہ" بیان فرمانے کی بجائے مختصر الفاظ میں کفائت شعاری پر لکچر دے ڈالا — مسلمانوں کو لہو و لعب اور فضول خرچیاں چھوڑ دینا چاہئے — اور کفائت شعاری سے کام لینا چاہئے — قیامت کے دن قریب ہیں وغیرہ وغیرہ —! چلتے چلاتے بادامی کاغذ کی ایک پڑیہ بڑھاتے ہوئے کہنے لگے — یہ خط اپنی خالہ جان کو دے دینا —

ہوا یہ تھا کہ پہلے دن اثناء گفتگو میں میں نے عنقریب اپنے مراد آباد جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا — چنانچہ یہ بادامی کاغذ کی پڑیہ دراصل ایک دستی خط تھا جو مولوی صاحب نے اپنی بیوی یعنی میری "خوش دو ساس" کی خدمت اقدس میں ارسال فرمایا تھا — جس کے "اوپری" کونے پر نہائت چمکیلی سیاہ روشنائی سے "بعونہ" اور "دکھنی" کونہ پر "دستی" تحریر تھا —

خود ساختہ لفافے کی تمام چولیں نہایت حفاظت سے چپکا دی گئی

تھیں — کہ کہیں میں ان کا یہ محبت نامہ کھول کر نہ پڑھ لوں —!

ظاہر ہے کہ اتنے چھوٹے سے کام کیلئے ایسے نزدیکی رشتہ دار سے انکار کرنا نہ محض بداخلاقی تھی — بلکہ اپنی مرحوم بیوی کی روح کو ایک طرح سے تکلیف دینا تھا —

مرادآباد پہونچتے ہی میں نے یہ خط مولوا نُن صاحبہ کی خدمت میں بھیجدیا — لیکن نوکر نے واپس آکر یہ سنائی سنائی کہ مولوانُن صاحبہ نے پوچھا ہے کہ آپ کب شاہجہان پور واپس جائیں گے — جس کے کھلے ہوئے معنی یہ تھے کہ کم ازکم مولوانُن صاحبہ کا محبت نامہ بھی لیجانا ضروری ہوگیا! تیسرے دن شاہجہان پور واپسی کے وقت ایک چھوٹی سی پوٹلی میں کتری ہوئی چھالیا۔ چکنی ڈلی وغیرہ مع ایک خط کے پہونچ گئیں —!

شاہجہان پور پہونچکر یہ سامان اور خط میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں بھیجدیا — چنانچہ سامان پہونچتے ہی مولوی صاحب ہمہ تن شکریہ خود تشریف لے آئے — اور دیر تک مرادآباد کے چشم دید حالات نہائت اشتیاق وانہماک سے پوچھتے رہے —!

منشی نیاز الدین صاحب تو اچھے ہیں —؟

اور مولوی کرم علی صاحب کی بیوی — چہ — چہ — چہ — کیا خوب آدمی تھے —!!

اب اس بڑی مسجد میں نماز کون پڑھاتا ہے — آجکل —

تو آپ خود گئے تھے اپنی خالہ جان کے پاس —؟

لاحول ولاقوۃ ـــ ارے بھئی تم سے کون پرن ـــ چہ خوش!

اب کب تک قصد ہے انشاء اللہ ـــ!

ظاہر ہے کہ اس قسم کے لغو سوالات کا میں کہاں تک جواب دے سکتا تھا ـــ مولوی صاحب تھے بہشتی ـ نائی ـ اور مہتروں تک کی خیریت معلوم کرنے کیلئے بے تاب ـ! بڑی مشکل سے رخصت ہوئے ـ

اب باقاعدہ یہ ہونے لگا تھا کہ مولوی صاحب میرے مرادآباد جانے کے پروگرام سے باخبر رہنے لگے ـــ اور ہر مرتبہ کم ازکم ایک دستی خط ـــ اور میلے کپڑوں کی گٹھڑی وغیرہ لیکر اسٹیشن پہونچ جاتے ـــ مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے یہ سامان میرے سامان کے پاس احتیاط سے رکھدیا جاتا! ـــ اور بس ـــ!!

مرادآباد سے واپسی پر مجھے اس سامان کے "تبادلے" میں کتری ہوئی چھالیہ، پکا ہوا کتھا، دھلے ہوئے کپڑے ـــ ایک آدھ حلوہ حتی کہ لگے ہوئے پانوں کی ڈبیا تک اکثر لانا پڑتی ـــ اور تھوڑے ہی دنوں میں ایک اچھی خاصی "دخانی کشتی" بن گیا تھا ـــ جو ساور سے خام پیداوار لاد کر دوسرے ملکوں میں لیجا کر وہاں سے "درآمد" میں ایسی چیزیں لادتا تھا جن کا دستیاب ہونا اپنے دیس میں ممکن نہ تھا ـــ!

حسب دستور قدیم ایک مرتبہ جو مولوی صاحب مجھے خدا حافظ کہنے کیلئے آئے تو پورے تین بکس کپڑوں کے ـــ اور ایک خوان کھانے کا ـ

ایک بورے میں تانبے کے برتن — اور صرف ایک دستی خط سا تھ تھا —
گاڑی چھوٹنے میں وقت بہت کم تھا انہوں نے جلدی جلدی سب سامان بھر
وادیا میرے درجہ میں — اور یہ عرض کرنے کا موقع ہی نہ دیا — کہ جناب
اس لڑائی کے زمانہ میں تنِ تنہا سفر کرنا تو دشوار ہے، چہ جائیکہ اس کثرت سے سامان
لاد دیا جائے!

ٹرین روانہ ہونے سے پہلے ہی مولوی صاحب نے خدا حافظ کہدیا تھا
اور سارے درجہ میں بیٹھے ہوئے مسافر میری جان کھائے جا رہے تھے۔
اجی — یہ سامان بریک میں رکھوائیے! یہاں جگہ نہیں ہے!
رام — رام — اوپر نہ رکھیئے گا کھانا — گنگا جلی رکھی ہے
وہاں —!

واہ صاحب — بکس ہٹائیے کھڑکی کیسے کھُلے گی —
مسٹر —! یہ مال گاڑی نہیں ہے — ڈیرہ ہے!
کہاں جانا ہے — آپ نے —؟

مارے غصہ کے میرا خود بُرا حال تھا — جی چاہتا تھا کہ سارا سامان کھڑکی
سے نیچے پھینک دوں — یا خود کھڑکی سے کُود کر خودکشی کر لوں —!
کیسے گھٹیے ہوتے ہیں وہ لوگ — جن کو دوسروں کی تکلیف کا کوئی
خیال نہیں ہوتا — خود غرضی تو دیکھئے پورے ویگن بھر سامان لاد دیا ہے
مجھ پر — یہ کفائت شعاری پر لیکچر جو دیئے جا رہے تھے اس روز — وہ اسی
روزِ بد کیلئے تھے — تا کہ دوسروں کو زحمت میں ڈال کر اپنا کام نکالا جائے۔

یکایک برتنوں کے بورے کی رسی جو کھلی تو ایک تانبے کا لوٹا جھانکنے لگا — جس پر موٹے موٹے لفظوں میں "رشید احمد خان یوسف زئی" لکھا ہوا تھا — میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی — یہ شاہجہان پور کے ایک بڑے رئیس تھے — جن کا انتقال ایک مہینہ پہلے ہو چکا تھا — یعنی یہ جو کچھ سامان میں لئے جا رہا تھا خاں صاحب کے چالیسویں میں بطور رشوت کے مولوی صاحب کو پیش کیا گیا تھا — تاکہ وہ مرنے والے کے لئے جنت میں ایک اچھی سیٹ "ریزرو" کرادیں — کھلنے کا یہ مطلب خان بھی انہیں کا توشہ آخرت تھا — اور ان صندوقوں میں انہیں کے کپڑے تھے — شاید — ! گویا کہ — اس عالم میں اگر کوئی جاننے والا دیکھ لیتا مجھے تو یہ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی کہ آپ کا شمار بھی خدا رکھے "ذوی القربا والیتامیٰ والمساکین" میں ہونے لگا ہے اس لڑائی کے زمانہ میں — !

کچھ غصہ — کچھ شرم — کچھ ذلت — ! ایک عجب حال تھا میرا — کئی اسٹیشنوں تک میری سمجھ میں یہ آیا ہی نہیں کہ گردن پر یہ چیونٹیاں سی جو رینگ رہی ہیں شیروانی کے نیچے تو کیوں — ؟ لیکن جب ہاتھ سے کھجا کر دیکھتا ہوں تو پتلی پتلی دھار سے قورمہ کی پلیٹ رس رہی ہے دھیرے دھیرے — ! شیروانی کے کالر سے لیکر پائجامے تک رشید احمد خان صاحب کے چالیسویں کا قورمہ بہہ رہا تھا — میرے کھجانے اور کسمسانے پر دو ایک مسافروں نے تو کھڑکی سے منہ نکال کر رومال لگا لیا — پاس بیٹھے ہوئے دو تین مسافر کچھ سرک گئے — !

زیادہ مار میں تو یہ بھول جاتی ہے ——— میرا یہی حال تھا اس وقت!
بدحواس اور پریشان ——— کہ یا اللہ کیا کروں ——؟ جیسے کیسے خوان کھول کر پلیٹیں برابر کیں اور اپنی جگہ پر چپ چاپ بیٹھ گیا ———

راستہ میں کئی مسافروں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی —کہ آخر کھانا ساتھ لانے کی کیا وجہ تھی —— مگر میں نے کسی قسم کا بیان دینے سے صاف انکار کر دیا
اب گاڑی مرادآباد کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے جیب ۔ سے مولوی صاحب کا دستی خط نکال کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھڑکی سے باہر اڑا دیئے!

اسٹیشن آچکا تھا کئی قلیوں نے مل کر یہ سامان باہر نکالا ——— چونکہ چیک ہوتے ہی کانٹے پر پہونچا دیا گیا ——— گیارہ روپیہ سوا تین دیکر میں جو پلیٹ فارم سے باہر آیا ہوں تو میرے پاس قلیوں کو دینے کے بھی دام نہ تھے ——— بیچارہ تانگے والا شریف تھا ——— اس نے یہ مشکل بھی آسان کی ———

گھر پہونچتے ہی پہلا کام جو کیا میں نے وہ یہ تھا کہ یہ تمام کھانا کپڑے اور برتن وغیرہ محتاجوں کو تقسیم کر دیئے —— جو نہایت صمیم قلب سے میری مغفرت کے لئے دعائیں کر رہے تھے۔

بھوک ہڑتال!

اے ہے — دو گز ملنے کی اوقات ہی کیا تھی — میں نے کہا — ! کہتے کہتے زبان سوکھ گئی — مگر آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں — دو دن میں بقر عید آئی جا رہی ہے — نگوڑا محبوب ننگا پھریگا ننگا — ؟

جیسے ایک دم سے ہوائی حملہ کا بگل بج گیا ہو اس طرح بیگم بول رہی تھیں کروشیا اور اون میز پر پٹکتے ہوئے پھر سلسلۂ بیان جاری کر دیا — !

اور آپ ہیں — کہ دن موئے یہ اخبار! رات اخبار — نہ گھر سے مطلب — نہ بچوں سے غرض! بس چوبیس گھنٹہ حقہ ہے اور اخبار — میں کہتی ہوں نوج کسی کو اخباروں کا روگ لگ جائے — !

بیگم" — میں نے عینک کی کمانی کو نچاتے ہوئے کہا! نہیں ملتا تمہاری جان کی قسم — ! سارا امین آباد ڈھونڈھ ڈالا — نخاس اور بزازہ چھان مارا — مگر ملینہ کا نام نہیں — تم تو جانتی ہو کہ لڑائی کے زمانہ میں — !

ہاں! ہاں — میں خوب جانتی ہوں! بیگم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا — سارا ملینہ جرمن اور جاپان کے کلیجہ میں گھس گیا — آفت پڑے اس لڑائی

پر — اچھا بہانہ مل گیا ہے ان سب کو! کوئی چیز کہو — لڑائی کی وجہ سے نہیں ملتی — جیسے ساری دنیا لڑائی پر چلی گئی ہے — نوکر ہیں وہ نہیں ملتے — مکان ہیں وہ نہیں ملتے — مہینوں سے کہہ رہی ہوں کہ یہ مکان سردیوں میں رہنے کے قابل نہیں — مگر آپ ہیں کہ ایک کان سنا اور دوسرے کان اڑا دیا —

سنو گی بھی کسی دوسرے کی یا اپنی ہی کہتی چلی جاؤ گی! میں نے کہا میں کہتا ہوں —

ہاں — کیا کہتے ہیں آپ —؟ بیگم بولیں —"

عرض کر رہا ہوں میں کہ — میں نے کہا "لڑائی کی وجہ سے تمام آدمی کارخانوں میں کام کرتے ہیں اسی سے ہر چیز کا توڑا ہے — ملینہ تو اب مارکٹ میں ہے نہیں —!

اور وہ جو نصیر میاں کی بیوی نے ابھی چار پانچ روز ہوئے منگوایا ہے وہ کہاں سے آگیا — بیگم نے جواب دیا —

اب یہ مجھے کیا معلوم! میں نے کہا — انہیں نصیر میاں کی بیگم سے پوچھو! کہیں بلیک مارکٹ سے خریدا ہوگا انہوں نے —

تو پھر تم بھی وہیں سے لے آؤ — بیگم بولیں —

واہ بھئی واہ —! یہ بھی تم نے اچھی کہی — بیٹھے بٹھائے مجھے جیل خانے بھجواؤ گی — میں نے جواب دیا —!

جی ہاں —! وہ کہنے لگیں — اور نہیں تو کیا — نصیر میاں بھی تو خدا نہ

کرے جبل خانے چلے گئے — یہ سب باتیں بس ایک نہ لانے کی باتیں ہیں
بیگم اُٹھ کھڑی ہوئیں —
بیٹھو — بیٹھو — تم خفا ہو گئیں! میں نے کہا — تم جانتی ہو کہ اگر
تمھارے کام —!
بس بس رہنے دیجئے "لّو چپّو" کرنے کو! دیکھا ہے۔ دو گز ململ نہ تو آپ
کے لائے نہ لایا گیا —

بڑبڑاتی ہوئی بیگم باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں۔

میں بڑی دیر تک "ترپاہٹ" کی اسی اُلجھن میں پڑا رہا — لڑائی
کی وجہ سے گرم کپڑا تو عنقا ہو گیا ہے۔ اور یہ عورتیں ہیں کہ بیٹھنے نہیں دیتیں —
دوپٹوں کی ململ وہ غایب — کنٹرول والے ہیں کہ ساری دنیا کو ساڑیاں
پہنا دینا چاہتے ہیں — یہ نہیں جانتے کہ ہندوستان کی عورتیں ساڑیوں
کے علاوہ ایک طرح کا اور بھی لباس پہنتی ہیں — جس میں ایک چیز
دوپٹہ بھی ہوتا ہے —

سامنے پڑے ہوئے اخبارات کی سُرخیاں نگاہوں کے نیچے ناچ
رہی تھیں۔ "مہاتما گاندھی نے مسٹر جناح کو مالش کرنے کی ہدایت کی۔ مسٹر چرچل
کیوبک سے آگئے۔ راجہ فارمولا ایک لعنت ہے دیس کے لئے"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سُرخیاں کلٹے کھاتی تھیں — اگر مسٹر جناح
نے گاندھی جی کے کہنے سے تیل مالش شروع کر دی تو کیا ہندوستان آزاد
ہو جائیگا — ؟ اگر مسٹر چرچل کیوبک سے واپس آ گئے تو — اگر راجہ فارمولا —

لعنت ہے تو ۔۔!

یہاں تو یہ فکر تھی کہ اگر بیگم ناراض ہو گئیں تو یہ "سوالاکھ" روپیہ کا مہر کہاں سے آئیگا اس لڑائی کے زمانہ میں جو ادا کیا جائیگا ان کو ۔۔ اور ان پاؤ درجن لڑکوں کو کس یتیم خانہ میں داخل کیا جائیگا ۔۔!

کھانا کھا کر دفتر روانہ ہوا تو وہاں بھی یہی سوچ رہا تھا ۔ کیونکہ چلتے وقت بیگم کی نگاہیں ۔۔ غضب آلود نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ شام کو ملیدہ نہ لائے ۔۔ تو ایک عجیب مخمصہ میں جان تھی ۔۔ میں نے سوچا کہ واقعی شادی بیاہ بھی کیا جھنجھٹ ہے "غم نداری بز بخر" ممکن ہے پرانے زمانے میں یہی ٹھیک ہو مگر اب آج کل تو جس کے سر کوئی جھگڑے نہ ہوں اسے چاہیئے کہ بیاہ کرے ۔ گویا کہ بیٹھے بٹھائے اتنی مصیبتیں آجائینگی ایک ساتھ کہ جینا دشوار ہو جائیگا ۔

اب یہی دیکھ نہ لیجئے کہ یہ بیگم صاحبہ جو ہیں ۔۔ ان سے کس مردود نے کہا تھا کہ آپ رفیقۂ حیات بنجائیے ۔۔۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی جو سمجھ لیجئے ۔۔۔ ہوا یہ کہ اماں جان کی نند کے گھر پیدا ہوئیں یہ ۔۔ اور ٹھیکرے ہی میں مانگ لی گئیں میرے لئے ۔۔۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ ایسی "جرنیل عورت" سے نباہ ہونا دشوار ہے ۔۔ مگر اب ۔۔ اب ۔۔ اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا ۔۔ ایک آدھ نہیں پورے پاؤ درجن لڑکے بھی "فلما" چکی ہیں وہ ۔۔ طلاق کے معاملے میں انسان دیوالئے کی درخواست بھی دے سکتا ہے ۔ لیکن ان پاؤ درجن بچوں کی ولدیت سے تو منکر نہیں ہو سکتا ۔۔!

چھوٹی تنخواہ ۔۔ تین تین بچے ۔۔ ایک بیوی ؛ اور سب سے زیادہ ۔۔

بی شمین — اللہ رکھے — روز ہی دو ایک چینی کے برتن شہید کرتی ہیں — لالٹین کی چمنی پھوڑ دی — شیشہ کا گلاس توڑ ڈالا — پوری گھڑونچی اُلٹ دی — اس پر طرّہ یہ — روزانہ دھمکیاں دیتی ہیں کہ میرا حساب کر دیجئے —

دو گز ملینہ کی تو خیر کوئی ایسی بات نہیں — "جہاں سو وہاں سوا" سہی — مگر بیگم کی "ترِیا ہٹ" تو اب دن بدن بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے — اور یہ جب سے مہاتما گاندھی نے "بھوک ہڑتال" کا طریقہ نکالا ہے — ایک نئی مصیبت پیدا ہو گئی ہے — جب خفا ہوئیں بھوک ہڑتال — جب بگڑیں "مرن برت" آئے دن یہی سیاسی تحریکیں میرے گھر میں زور پکڑتی جا رہی ہیں —!!

کام میں کس کا جی لگتا تھا — سارا دن یہی سوچا کیا —!

قریشی صاحب سے پہلی کے وعدہ پر پچیس روپیہ قرض لیے — دفتر سے اٹھ کر بزازے آیا — بڑی دوڑ دھوپ اور تلاش و جستجو سے ایک جگہ گلابی رنگ کا ملینہ ملا — خدا خدا کر کے ایک کاغذ میں جلدی جلدی لپیٹ کر جیب میں رکھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے —

یکے تانگوں کی "ہٹو بچو" سے بچتے بچاتے جو گھر میں پہونچتے ہیں تو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ "وارد ھا نگر ہے —" "ہم وارد ھا سے بول رہے ہیں" — یعنی کہ سارے گھر میں "مرن برت" اور "بھوک ہڑتال" تھی —!

بیچوں بیچ انگنائی میں کھٹولے پر بی نصیبن اپنے جھونٹے پھیلائے ہوئے کنگھی فرما رہی تھیں — وہی ٹوٹی کنگھی جو اس وقت اُن کے ساتھ جہیز میں آئی تھی — جب کہ — بابل مورا نیہر چھوٹا جائے —!

محبوب اور مرغوب اندر والے کمرہ میں تخت پر چپ چاپ پڑے تھے — اور دالان میں بیگم منہ پھلائے میری قسمت کا رونا رو رہی تھیں —!

گھر میں داخل ہوتے ہی ایک ہلڑ سا مچ جاتا تھا — مگر آج تو بی نصیبن تک اسقدر محوِ آرائش تھیں کہ ان کو میرے گھر میں آنے تک کی خبر بھی نہ ہوئی — میں روزانہ دفتر سے آ کر ناشتہ کرنے کا عادی تھا مگر آج — باورچی خانہ میں ایسا سناٹا تھا جیسے آج ہی اس گھر میں کوئی غمی ہوئی ہے —!

بیگم کے پاس جو پہنچا تو وہاں کا رنگ ہی دوسرا تھا — میں نے پوچھا — کیسی ہو — مگر کوئی جواب نہ مِلا — ناشتہ کو پوچھا اس کا بھی کوئی جواب نہیں — آج کھانا کیوں نہیں پکا — اس کا بھی جواب نہیں —! گویا کہ ایک چپ میں سو بلائیں ٹل رہی تھیں — بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ آخر معاملہ کیا ہے —؟ یکایک خیال آیا کہ یہ ہے۔ "دو گز ململ"

جوں ہی جیب سے ململ نکال کر دیا — کھلکھلا کر ہنس پڑیں —! منہ لاتے ململ تو جانتی — ارے نصیبن میاں کا ناشتہ لگاؤ —"

— ⁘ —

منجدھار

"جیجا — اگر ایک ہزار کا ہوتا ہو تو بات پکی کرا دوں"

رمیشور نے فیصلہ کن انداز میں بکرما سے کہا — ؟

ایکہزار تم کہتے ہو — بکرما بولا — میں تو دو ہزار خرچ کر دیتا "ہلسیا" کے بیاہ پر — مگر یہ تو دیکھو "سمے" کیسا لگا ہے — سب تو سب لڑائی کے چندوں نے سب سے زیادہ دیوالہ نکال دیا ہے — ابھی اگھن میں دوانّی روپیہ کی تحصیل ہو چکی ہے — اب سنا ہے کہ بیساکھی میں چونی روپیہ وصول کیا جائیگا — پھر "مل" پر "الگ — وارفنڈ" کٹتا ہے اور "پڑاو" پرکٹوتی کے ساتھ الگ! یہ سمجھ لو کہ کسان کو بچتا ہی کیا ہے — ضلعدار اور کارندوں کی دھمکیاں الگ! بھگوان جانے کیسے "نباہ" کر رہا ہوں! کل چار بیگھہ اونکھ ہے اور اس پر سارا ٹنٹا پھیلا رکھا ہے — سب سے زیادہ "ہلسیا" کا بیاہ —

یہ بپتا تو سنسار کے ساتھ ہے جیجا — رمیشور نے جواب دیا! — خود مجھے دیکھو اسی سال خالی ایک ہزار مقدمہ بازی میں تاپ چکا ہوں ٹھاکر سے چھیٹا ہو گیا تھا — وہ ٹھہرے زمیندار اور میں ایک غریب آدمی — پر میں نے

سوچ لیا کہ میں تو کسی نہ کسی طرح کما ہی کھاؤں گا لیکن ان ٹھاکر صاحب کی زمینداری ہگوا کر دم لوں گا ــــ ہم لاکھ پاسی سہی مگر اب ایسا بھی نہیں کہ وہ چھتری ہوکر دوسروں کی عزت بگاڑتے پھریں ــــ!

آبرو کا معاملہ ہوتا ہی ایسا ہے ــــ پاسی ہوئے تو کیا ــــ کبھی ہمارے "پرکھے" بھی یہاں راج پاٹ کر چکے ہیں ــــ یہ ان ریت تو ان اونچی ذات والوں نے ہمکو مٹانے کیلئے شروع کی ہے ــــ

بکرما نے تاریخ کی روشنی میں "رج پاسیوں" کی خاندانی عظمت کو دُہراتے ہوئے کہا ــــ!

کلجگ کی مایا ہے ــــ غریب کی آبرو ــــ بھگوان جانے ان بڑے آدمیوں کی نگاہوں میں کیا رہ گئی ہے اب ــــ نہیں تو پُرانے زمانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا جیجا ــــ

رمیشور کہنے لگا ــــ

ہاں بھیّا ــــ غریب کی آبرو ــــ! بکرما کہتے کہتے رُک گیا اور بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا ــــ!

"رمیشور"! مجھے اس وقت بس یہی "چنتا" ہے کہ "ہلسیا" کے کام سے فرصت مل جائے ــــ!

میں نے تو کہدیا جیجا ــــ چندن ایک ہزار مانگتا ہے ــــ اور یہ بھی سمجھ لو ایسا لڑکا دس بیس کوس میں نہ ملیگا ــــ کھیتی باڑی کا سارا کام خود کرتا ہے اور پڑھتا بھی ہے! ہلسیا سدا سکھ چین سے رہے گی ــــ

رمیشور نے جواب دیا:-

خیر اگر چندن نہ مانیں تو اقرار کر لینا ــــ ورنہ میری بساط تو جتنی ہے تم خوب جانتے ہو ـــ اچھا اب "آگیا" دو ــ اور جتنی جلدی ہو سکے بات چیت پکی کر کے خبر دینا تاکہ "چھدن" ہو جائے۔

بکرما اٹھ کھڑا ہوا۔

ہاں ہاں ـــ رمیشور نے کہا ــ بے فکر رہو بھگوان نے چاہا تو سب کچھ جلدی ہی طے کر کے خبر دوں گا۔!

جے رام ــ جے رام ــ کہتے ہوئے دونوں ایکدوسرے سے جدا ہو گئے۔

پاسیوں کے "کولھو" پر آج کچھ زیادہ بھیڑ تھی ــ سر شام ہی جبکرن مراؤ ــ نند الکمہار ــ منسانائی اور ٹھاکر سترو ہن سنگھ "گڑھاؤ" کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے! جنکی ٹولی سارے گاؤں میں مشہور تھی ــ یہ لوگ آدھی رات تک بکرما پاسی کے گھر کے چکر کاٹا کرتے تھے ــ لچھمن بنیئے کی دکان سے بڑی کا بنڈل لیکر سر شام ہی یہ لوگ اُدھر پہونچ جاتے ـــ اور جیسے ہی "ہلسیا" جنگل جانے کیلئے اپنے گھر سے نکلتی یہ سب لوگ بھی کھانستے کھکھارتے اس کے پیچھے ہو لیتے ــ سیٹیاں بجاتے اور دھیمے دھیمے سُروں میں گنگناتے ــ خدا جلنے کیا ــ مگر اس نے کبھی نگاہ بھر کر بھی ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا شاید وہ سمجھتی تھی کہ ہوں گے زمیندار ـــ گلاب سنگھ کے بیٹے ہیں تو میرا کیا رے لیں گے! گوئی میں ان کی "پٹی" میں بستی ہوں جو مجھپر کوئی دباو ڈال سکیں گے

بیگار کو پکڑ وا بلائیں گے؟ میرا باپ تو کورٹ کی "پٹی" میں بستا ہے اور کورٹ ہی میں زمین جوتے ہے۔! وہ ہمیشہ ان لوگوں سے کترا جاتی تھی۔

آج بکرما کی "پیر" تھی اور پاسیوں کے "گڑور" پر اچھا خاصا جمگھٹا لگا ہوا تھا کیونکہ آج ساری رات کی "پیر" میں ہلسیا کا ہونا ایسا ہی ضروری تھا جیسے بکرما کا ۔۔۔ اونکھیں لگانا ۔ جھونکنا ۔ رس چھنوانا اور "پاگ" جمانا ۔ یہ سب کام ہلسیا ہی کو کرنا پڑتے تھے ۔۔۔ بکرما تو گڑور میں لیٹا لیٹا حقہ پی پی کر صرف کھانسا کرتا تھا ۔ یا کبھی کبھی اونگھائی سے چونک کر کہتا ۔

"ہلاسا ۔۔۔ تنی چلم بھر دے"

سورج نکلتے نکلتے ہلسیا اور اس کا چھوٹا بھائی "جگا" چھ چھ پسیری کی دو بھیلیاں جما کر رکھ دیتے اور بکرما نگاہوں ہی نگاہوں میں یہ اندازہ لگایا کرتا کہ اگر یہ گڑ کی بھیلیاں جہیں "چکتے" میں بک جائیں تو گاڑی کا کرایہ ۔۔۔ چونگی کا محصول اور کٹوتی کے جھگڑوں سے چھٹکارا مل جائیگا ۔ نہیں تو انتظار کرنا پڑے گا کہ جب یہ "تیرہان" پورا ہو جائے تو شہر لیکر جائیں ۔۔۔ مگر آج کل بھاؤ تو گھڑی گھڑی چڑھتا اترتا ہے ۔۔۔ ابھی پرسوں سوا چار سیر کا بھاؤ تھا ۔ کل ہی معلوم ہوا کہ ساڑھے چار سیر کا ہو گیا ۔۔۔

بکرما کی نگاہیں آج "گڑھاؤ" کے ایک ایک گھان میں ہلسیا کا بیاہ رچا ہوا دیکھ رہی تھیں وہ سوچ رہا تھا کہ اگر چار بیگہ اونکھ میں سب خرچہ نکال کر پانچ سو بھی بچ گئے تو پانچ سو کہیں اور سے بندوبست کر کے اس سال ضرور "ہلسیا" کا بیاہ نپٹا دوں گا ۔۔۔ پہاڑ ایسی جوان لڑکی ۔۔۔ گاؤں کا رنگ الگ

بہرنگ ـــ پھر غریبی ـــ جانے کیا ہو۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہاں ٹھاکر لوگوں نے چمپا چمار کی آبرو بگاڑ ڈالی ـــ قسم تو ستر وہن سنگھ اب بھی کھاتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہوئی ـــ مگر " جنگا" نے بھرے پنچوں میں گنگا اٹھالی ـــ کہ..... کہ..... یہ لڑکا انہیں ٹھاکر ستروہن سنگھ کا ہے ـــ پھر اگر ان کا لڑکا نہیں تھا تو دروغہ جی کو دو سو روپیہ پوُج کیوں دیئے۔ اس نرسنگ پور میں جو یہ چھوت لگ گئی ہے وہ انہیں پاپوں کی کرنی ہے ـــ چاروں طرف ایک ہائے ہائے مچی ہوئی ہے ـــ آج اس کے کھیت کٹ گئے ـــ کل اس کا کھلیان پھونک دیا گیا ـــ پرسوں کسی کے گھر میں سیندھ کٹ گئی! میری چار پیڑھیاں اسی گاؤں میں بیت گئیں اگر ایسا ہی پاپ اور انیائے ہوتا تو کیسے بسر ہوتی ـــ

صبح ہوتے ہی پاس پڑوس گاؤں کی بیوپاری گڑ خریدنے کیلئے آگئے جو اونے پونے گڑ خرید کر شہر کی منڈیوں میں خوب نفع کمار ہے تھے بکرما کا سودا بھی سامنے آگیا۔ مگر مول تول میں کچھ بات ایسی بگڑ گئی کہ بکرما نے قسم کھالی کہ چاہے تم ایک روپیہ سیر بھی خریدو گے تب بھی تمہارے ہاتھ کبھی نہ بیچوں گا ـــ اب سوائے اس کے کہ بکرما اپنا "تیر ہان" پور اگرے شہر کیلئے گاڑی بھرتا کوئی صورت ہی نہ تھی ـــ اس کے پاس کل پانچ " بھیلیاں " تیار تھیں جب تک پوری تیرہ پاریان نہ ہو جائیں گاڑی بھرنے میں کوئی فائدہ بھی نہ تھا ـــ یہی سونچکر بکرما نے اپنے حصّہ داروں سے کہدیا کہ بھائی میری

"ادسری" میں تم پر لینا۔ مجھے یہ "تیرہان" پورا کر لینے دو۔ شنکر اہیر ذرا سخت مزاج آدمی تھا مگر بکرما کی لجاجت بھری التجا وہ بھی نہ ٹھکرا سکا۔!

کل کی پیر میں سترو ہن کی پارٹی آدھی رات تک بیٹھی ہوئی تاپتی رہی مگر "ہلسیا" نے کسی کو موقع ہی نہ دیا۔ اسی سے گھبرا کر باری باری سب لوگ ٹھٹھرتے جاڑے میں اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔! لیکن آج سترو ہن نے یہ سونچا کہ شائد اس بھیڑ میں زندگی بھر ہلسیا سے بات ہی نہ ہو سکے۔

اس لئے آج دس بجے کے بعد جب آگ تاپتے تاپتے بہت سے نوجوان مایوس ہو کر جا چکے تھے وہ "گڑور" پر پہونچا۔ بکرما "گڑور" کے اندر رضائی اوڑھے ہوئے چپ چاپ لیٹا تھا۔ اور ہلسیا گڑھاو کے سامنے بیٹھی ہوئی جھونگنا جھونک رہی تھی جس کی تیز تیز لپٹیں بھٹی کے اندر سے نکل کر دور دور تک روشنی پھیلا رہی تھیں۔!

سترو ہن چپ چاپ جا کر آگ کے پاس بیٹھ گیا "جگا" اونگھا اونگھا کر کولھو میں اونکھیں لگا رہا تھا۔ اور بڈھا کنور منہ سے دھوتی اوڑھے ہوئے بیل ہانک رہا تھا۔!

کیا بکرما کاکا سو گئے؟

سترو ہن نے ہلسیا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کتنی دیر ہے اس پاگ میں۔

سترو ہن نے دوسری طرح پر سلسلہ کلام شروع کرنے کی کوشش کی

— لیکن ہلسیا نے اب بھی کچھ جواب نہیں دیا —!

" کیا سو گئی ہلسیا —؟

ستروہن ذرا قریب کھسک گئے —

" نہیں تو " —— کچھ اونگھائی آرہی ہے —

ہلسیا بولی —

تو ہٹ — لا میں جھونک دوں —— ذرا آنکھ لگا لے تو بھی —!

ستروہن اور بھی نزدیک پہونچ جانا چاہتے تھے —

نہیں دادا —— رہنے دو! ابھی تو تین دن یہی کرنا ہے جب تک ستیہ ان پورا نہ ہوگا ہم لوگوں کو چین کہاں ——!

وہ کہنے لگی —!

اسی سے تو کہتا ہوں —— ستروہن کہنے لگا —— یہیں پڑ رہ میں جھونک دوں گا — اب ستروہن " جھونکنے " کے قریب پہنچ چکے تھے اور ہلسیا کھسک کر اونگھ کی پتائی پر آگئی تھی —— اپنی کالی کالی اوڑھنی اوڑھکر وہ وہیں زمین پر لیٹ رہی ——!

ہلسیا کو لیٹے ہوئے ابھی گھنٹہ بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ کڑھاؤ کی بھٹی سے نکلتے ہوئے دو شعلے اس کے جسم تک پہونچ گئے جیسے! گرم گرم شعلے —— بہت تیز تیز —— اونگھ کی سوکھی ہوئی پتیوں کے نیچے سے ہو کر یہ شعلے اس کے نازک نازک جسم سے مس ہو گئے! مس نہیں بلکہ پیوست ہو کر اس طرح جم گئے جس طرح اس کے برف کی سل جیسے سرد جسم میں دو گرم سلاخیں

کس نے چھو دی ہوں ــــ وہ چونک سی پڑی ــــ بدن خود بخود سُکڑ گیا ــــ یہ تو کسی کے ہاتھ تھے ــــ!

"ستروہن دادا ــــ!"

وہ اُٹھ بیٹھی ــــ لیکن اُسکی نگاہوں سے غیظ و غضب کے آثار نمایاں تھے ــــ

"ہلسا ــــ ستروہن ہلسیا کو ہلسا بنا دینا چاہتے تھے! دیا کرو مجھ پر دیا ــــ!... نہیں تو تمہارے کارن میری جان جائیگی ــ

بس ہو چکا ــــ وہ کہنے لگی! ٹھاکر رہنے دو! اگر کسی نے سن لیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی ــــ؟

مگر ــــ وہ تو کسی نہ کسی دن سب سن ہی لیں گے! جب میں نہ ہوں گا تو گاؤں بھر سارا حال جان جائیگا ــــ

ستروہن نے "بدنامی" کی پوری دھمکی دیتے ہوئے جواب دیا ــ! اتنے میں بکرما گڑور میں کھانسنے لگا ــــ!

اری ہلسیا ــــ چلم بھر دے ــــ!

ستروہن جلدی سے اُٹھکر اپنے گھر کی طرف چلدیا یہ کہتے ہوئے "کہ کل آؤں گا" ــــ!

روسے اور ڈھاک کی سوکھی ہوئی پتیاں اور ٹہنیاں جھونکتے ہوئے ہلسیا سوچ میں پڑ گئی ــ کہ بھگوان اب کیا ہوگا ــــ؟ اگر ستروہن نے بدنام

ہی کر دیا تو پھر کیا ہوگا میں تو کہیں کی بھی نہ رہوں گی — بھگوان جانے لوگ کیا سمجھیں — اور رمیشور ماما کیا خیال کریں — کہیں گے کہ اس نرسنگ پور کی تمام لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں —!

گرم گرم آنچوں کے سامنے جمائیاں لیتے ہوئے اُس نے ایک بھرپور انگڑائی لی کر پھر اپنے خیالات کو سمیٹنے کی کوشش کی — کتنا پاپی ہے سترو ہن ہیں تو اسے "دادا" کہتی ہوں — اور..... اور!

یکایک اس کی نگاہیں اپنی ہنسلی کے نیچے تک پہنچ گئیں۔ جہاں سے کالی کالی اوڑھنی سُرک کر اس کے دونوں شانوں پر پہنچ چکی تھی!۔ ایسا محسوس ہونے لگا اُسے! جیسے دو گرم گرم تیز شعلے سوکھی ہوئی پتیوں سے نکل کر اس کے سینے تک پہونچ گئے ہیں — الھڑپنے کی ایک شرم نے اس کی نگاہیں جھکا دیں —!

پاگ میں سے "میل" کی جھاگ اُبل رہی تھی۔ کڑھاؤ کی آگ بڑی طرح تیز ہو چکی تھی وہ مست و بیخود اُن گذرے ہوئے واقعات کو سوچ رہی تھی جو ابھی تھوڑی دیر ہوئے بیت چکے تھے!

بکرما — سلفہ چلم کے دس بارہ گھونٹ کھانس کھونس کر پی چکا تھا۔ اور اپنی پھٹی ہوئی رضائی میں خراٹے لینے کیلئے پہونچ گیا تھا — کہ یکایک ایک دبی ہوئی آہٹ پھر معلوم ہوئی — ہلسیا نے دیکھا ستروہن سامنے کھڑا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اس کے قریب پہنچ گیا!

ہلسیا کے پاس چپ چاپ بیٹھ کر بھٹی سے نکلتی ہوئی آنچوں سے

وہ اپنے ہاتھ سینک رہا تھا ---!

"ہلسیا --- مجھے اسی آگ میں ڈال دو --- نہیں تو میں خود ہی پھاند پڑوں گا --- آج میرا تمہارا فیصلہ ہو کر ہی رہیگا ---!

ستروہن آج سب کچھ کہہ ڈالنا چاہتا تھا ---!

بولو --- بولو! کیا کہتی ہو --- ایک ذرا سی بات!

وہ کانپنے لگی --- اس کی نگاہوں میں غیظ و غضب کے بھڑکتے ہوئے شعلے بجھ گئے --- اور --- اور ستروہن اس سے قریب ہوتا چلا گیا --- اتنا قریب کہ ان کے جسموں سے نکلتے ہوئے بہت ہی تیز شعلوں نے بھٹی کی آگ کو بالکل سرد کر دیا ...... ! اتنا سرد کہ اونگھتے ہوئے "جگا" نے کولھو کے پاس سے پکار کر کہا:-

"جیا --- آگ ٹھنڈا ہوا جاتا ہے --- کیا سو گئی --- ؟"

سوکھی ہوئی گھاس اور پتیوں سے ایک آہٹ کا طوفان امنڈ پڑا --- وہ گھبرا کر اس سے الگ ہو گئی اور دونوں ہاتھوں سے ڈھاک اور روسے کے سوکھے ہوئے پتوں کو سمیٹنے لگی ---!

ہلسیا کے بیاہ کی بات چیت پکی ہو چکی تھی اور بکرما نے "چھدن" کی رسم بھی ادا کر کے گویا چندن پاسی کے لڑکے کو باقاعدہ داماد بنا لیا تھا --- صرف "بھنوری" اور "گونا" باقی تھا ---!

اس دن کے واقعہ کے بعد ہلسیا اور ستروہن اکثر چھپ چھپا کر ملتے

رہے یہاں تک کہ یہ چھپ چھپ کر ملنا چھپ نہ سکا — اور ہلسیا نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کے پیٹ کے اندر پورا "پنجاب میل" دوڑ رہا ہے بہت تیزی کے ساتھ بھک بھک کرتا ہوا — جس کے انجن میں کئی درجن گاڑیاں لگی ہوئی ہیں —! بیاہ میں ابھی پورے تین مہینے باقی تھے اور یہ بڑھتی ہوئی تبدیلی دن بدن اسے حیران کئے ہوئے تھی! آخر اس نے دبی ہوئی زبان میں ایک دن سترو ہن سے کہا:-

ٹھاکر — تمہیں کچھ خبر ہے — میں تو کہیں کی نہ رہی —!

کیوں ہلسیا کیا ہوا — ؟

ٹھاکر نے پوچھا —!

تمہارا پاپ رنگ لا رہا ہے —!

وہ مسکرا کر بولی —!

میرا پاپ! سترو ہن نے روکھے پن سے جواب دیا — جیسے تم تو نردوش ہو —!

نردوش تو نہ تم ہو نہ میں — پر تمہارا دوش زیادہ ہی ہے -!

ہلسیا نے کہا!

تو تم چاہتی کیا ہو — اب ..... ؟

ٹھاکر بولے —!

یہ میں کیا جانوں — دو مہینے بعد میرا بیاہ ہوگا —

ہلسیا نے ٹھاکر کے چہرے پر آنکھیں جمادیں —!

پھر کیا ہے ——— وہ کہنے لگے بے فکر رہے دولہا کو بلا جوتے بوئے
—— بے محنت مشقت کئے —— فصل تیار مل جائیگی ——!
ہونھہ —— ہٹو! ہلسیا نے تنک کر کہا —— تم تو مذاق کرتے ہو!
مذاق —— یہ اچھی کہی تم نے! ٹھاکر نے کہا! میں اس معاملے
میں کیا کر سکتا ہوں آخر —— ؟
یہ میں کیا جانوں —— اب میری لاج تمہارے ہاتھ ہے!
ہلسیا نے جواب دیا ——!
مگر —— مگر! میں اس معاملے میں بالکل مجبور ہوں ——!
سترو ہن نے کہا —— اب مجھے دیر ہو رہی ہے —— جا رہا ہوں ——!
ہلسیا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں —— اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے
لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا ——!

جوں جوں ہلسیا کے بیاہ کے دن نزدیک آتے جا رہے تھے اس
کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی جا رہی تھی، ہلکا ہلکا سا بخار۔ بھاری
بھاری سر —— بُری بُری ڈکاریں —— کچھ عجیب عالم تھا —— سب سے
زیادہ یہ سوچ کہ اب کیا ہوگا —— ؟ اپنی ظاہری حالت کو چھپانے کے لئے
وہ بہت ہی کم اپنے گھر سے باہر نکلتی —— لیکن اس کے باوجود بھی بھانپنے
والی عورتوں نے تمام کیفیت بھانپ لی تھی —— اور سارے گاؤں میں جوان
اور بوڑھی عورتیں کھسر پھسر کر رہی تھیں —— عجیب عجیب قسم کی چہ میگوئیاں ——!

کوئی کہتا ۔۔۔ کہ یہ توصد اکی ایسی ہی تھی ۔۔۔ کسی کا خیال تھا کہ اُس کی ماں اور تمام کنبہ ہی ایسا ہے ۔۔۔ خود ہلسّیا بیاہ کے تیسرے مہینے بعد پیدا ہوئی ۔۔۔!

مختصر یہ کہ سارا نرسنگ پور دھیرے دھیرے سُلگ رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ نرسنگ پور میں یہ کوئی پہلا واقعہ تھا بلکہ اس لئے کہ یہ ایک غریب پاسی کی آبرو کا سوال تھا! ورنہ سبھی جانتے تھے کہ ٹھاکر ملکھان سنگھ کے گھر میں کیا ہوا جو اس گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار ہیں ۔۔۔! اس قسم کے درجنوں واقعات آئے دن اس گاؤں میں ہوتے رہتے تھے مگر آج ہلسّیا کا پاپ گناہ کی اس دنیا میں پہنچ چکا تھا جہاں پاپ پاپ سے ”مہا پاپ“ بن جاتا ہے! ہلسّیا نے کئی بار گڑگڑا کر ستروہن سنگھ سے مدد مانگی ۔۔۔ مگر ہمیشہ ٹھاکر نے بُری طرح دھتکار دیا ۔۔۔ جیسے اس پاپ سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا ۔۔۔ بکرما کے کان بھی اب وہ سب کچھ سن چکے تھے جو ایک باپ کو نہ سننا چاہیئے تھا ۔۔۔ مگر مصیبتوں کا یہ قافلہ جگ ہنسایاں سنتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔۔۔! چپ چاپ! بالکل خاموش ۔۔۔ ایک ایسی منزل کی طرف جہاں تباہیاں ہی تباہیاں تھیں ۔۔۔!

جس گاؤں کے بچہ بچہ کی زبان پر صرف ایک ہی کہانی ۔۔۔ ایک افسانہ اور ایک ہی قصہ تھا ۔۔۔ پھر بھی ”گناہ کی روداد“ بن بانٹ اگر ٹھہر جاتی ہو۔ اگر پاس پڑوس کے دیہاتوں میں اس کا چرچا نہ ہوتا تو تعجب ہی تھا ۔۔۔ چنانچہ ہلسّیا کا پاپ خس پوش چھپروں پر چڑھ کر زور زور سے چیخ رہا تھا ۔۔۔ چنگھاڑ

رہا تھا ۔۔ اور اس طرح شور مچا رہا تھا جیسے دنیا میں سب سے پہلا پاپ ہلسیا ہی نے کیا ہے ۔۔

بوڑھا بکرم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ساری دنیا کی طرف دیکھ رہا تھا بے بسی اور لاچاری کے ساتھ ۔۔ بھگوان یہ کیا ہو گیا ۔۔ ایشور! گلے جنم میں میں نے وہ کون سا پاپ کیا تھا جس کا بھگتان آج بھگتنا پڑ رہا ہے ۔ جسکی سزا آج دی جا رہی ہے مجھے ۔۔ اب میں کس منہ سے چندن کے دروازے پر ہلسیا کا "پاپی ڈولہ" چڑھانے جاؤں گا ۔۔ بھائی ۔ برادری اور سارا سنسار کیا کہیگا مجھے! دنیا کیا سمجھے گی!

اور ۔۔ اور ۔۔ بھگوان اب کیا ہو گا ۔؟ وہ کسمسا کر اپنی آنکھیں موند دیا جو اس پاپی سنسار کی رنگین روشنی سے اکتا گئی تھیں ۔۔ یہ کلجگ ۔۔ اینائے ۔۔ اندھیر ۔۔ پرماتما تو کہاں ہے ۔۔!

دھرتی ماتا تو نے اس جیون سنسار کو کیوں نگل نہ لیا اب تک ۔!

"جیجا ۔۔ میری ناک بھی کٹوا دی تم نے ۔۔"!

اس کے کان بجنے لگے ۔۔ رمیشور کہہ رہا تھا سامنے کھڑا ہوا ۔۔

بکرما سوچنے لگا کہ اگر رمیشور یہ کہیگا تو میں اسے کیا جواب دوں گا ۔ میری آنکھیں بھی اس سے چار نہ ہو سکینگی ۔۔

بکرما کا خیال غلط نہ تھا ۔۔ چندن اور رمیشور کو جب یہ خبر پہنچیں تو صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ ایسی پاپی لڑکی سے بیاہ کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں ۔۔ بیچارہ بکرما اس کا جواب ہی کیا دیتا ۔؟ اپنی مجبوری اور لاچاری پر دل

مسوس کر رہ گیا ــــ

اپنی نگاہوں کے سامنے اپنا گھر اجڑتے دیکھکر اسے سارے سنسار سے نفرت ہو چکی تھی ــــ یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی ــــ ایک ایسی نفرت کہ اگر اس کا بس چلتا تو اپنے بدن کی بوٹیاں تک نوچ نوچ کر ان کوؤں کو کھلا دیتا جو سارا دن اس کے باجرے کے کھیتوں کو ستیاناس کرتے رہتے ہیں ــــ ایک ایسی نفرت کہ اگر اس کی بوڑھی ہڈیاں جواب نہ دے چکی ہوتیں تو وہ نرسنگ پور کے بچہ بچہ کو زندہ جان جیتا میں ڈھکیل کر سرکاری کاغذات کی تائید کر دیتا کہ پاسیوں کی قوم ہندوستان میں سب سے بڑی جرائم پیشہ قوم ہے ــــ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ قریب قریب پاگل ہو گیا تھا۔ بخار کی شدت میں خدا جانے کیا کچھ بکتا رہتا دن رات ــــ!

اتنے دنوں میں اس نے کبھی بھی ہلسیا سے یہ نہ پوچھا کہ آخر یہ تو نے کیا کیا ــــ؟ شائد وہ سمجھتا تھا کہ وہ نردوش ہے یا اس نے یہ سونچا ہو کہ چٹخے ہوئے مکان کی دیواریں تالاب کی چکنی مٹی سے بھری نہیں جاتیں ــــ!

یہی حال ہلسیا کا بھی تھا اس نے بھی باپ کے سامنے اپنی کوئی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ــــ ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ کے ڈھانچے پر مضمحل اور اداس پڑے پڑے وہ بڈھے باپ کی جانکنی کا نظارہ کرتی رہتی۔ چپ چاپ ــــ خاموش بیٹھے بیٹھے وہ بکرما کی آتی جاتی سانسوں پر دھیان لگائے تھی ــــ جانے کیوں؟ کیا بکرما کی زندگی میں اسے اپنی موت نظر آ رہی تھی نہیں نہیں ــــ وہ اس کا باپ تھا ــــ ایسا باپ جس نے اسکی وجہ سے اپنے

سارے گھر کی بربادی برداشت کی تھی ۔۔۔! جو سب کچھ دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا ۔۔۔ جس نے کبھی بھولکر بھی اس سے کچھ نہ پوچھا ۔۔۔! ۔۔۔ مگر اس کی اکھڑتی ہوئی سانسیں جیسے ہلیا کو زندگی کا پیام دے رہی تھیں ۔۔۔ ہمیشہ جینے والا پیغام ۔۔۔ سدا زندہ رہنے والا پیام ۔۔۔ کبھی نہ مرنے کا سندیس ۔۔۔ کیونکہ پاپ کبھی مرتا نہیں ۔۔۔ لوگ نیکیوں کو بھول جاتے ہیں ۔۔۔ مگر برائیوں کو نہیں ۔۔۔؟

بکرما کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا دیا بھڑک رہا تھا ۔۔۔ ہلیا ٹکٹکی باندھے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی کہ مرنے والے کی آخری ہچکیوں نے شاید اسکی تمنا پوری کر دی ۔۔۔ بکرما مر چکا تھا ۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس نفرت خیز دنیا کو چھوڑ چکا تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ہلیا کے سامنے زمین پر اس کے "ان سمجھے پاپ" کی پہلی نشانی پڑی ہوئی بلک بلک کر رو رہی تھی شاید اس لئے کہ وہ اس پاپ کی دنیا میں آنا نہیں چاہتی تھی ۔۔۔

ختم شُد